شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن

سہ ماہی البیان کراچی

اپریل تا جون 2014، اجراء: جولائی 2014

ماہِ رمضان میں سلف صالحین کے شب و روز

رؤیتِ ہلال

زکوٰۃ فرضیت، مصارف و مسائل

شوال کے 6 روزے

الكتاب السنة

مجلس البحث العلمي

AL-MADINA ISLAMIC RESEARCH CENTER

www.islamfort.com

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

سہ ماہی البیان کراچی

سلسلہ نمبر 11
جولائی 2014
تا
ستمبر 2014

فہرست مضامین

زرتعاون شمارہ
60 روپے
سالانہ بکنگ پر خصوصی رعایت

بیرون ملک
زرسالانہ 12 ڈالر
فی شمارہ 3 ڈالر
(علاوہ ڈاک خرچ)

Bank Al-Habib A/C No:1103-0081-002746-01-2 تفصیلات کے لئے 03333574685

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر
AL-Madina Islamic Research Center
مسجد سعد بن ابی وقاص ڈیفنس فیز 4 '11 کمرشل اسٹریٹ
نزد نثار شہید پارک وگذری پولیس اسٹیشن کراچی

Ph:+92-21-35896959
Mob 03322135693
WEBSITE:
WWW.ISLAMFORT.COM
E-MAIL:
albayanmirc@gmail.com

اداریہ

مسئلہ رؤیت ہلال

حافظ صلاح الدین یوسف [1]

شریعت اسلامی میں تہوار کے دن اور اکثر عبادات چاند کی تاریخ سے متعلق ہیں ، جیسے عیدالفطر ، عیدالاضحیٰ ، روزے ، حج اور دیگر عبادات چاند کی تاریخ کے حساب سے ادا کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی ملکوں میں رؤیت ہلال کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے باقاعدہ کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جو تمام ذرائع بروئے کار لاکر چاند کے ہونے اور نہ ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ اختلاف مطالع کی بنا پر مختلف ممالک میں چاند مختلف دنوں میں نظر آتا ہے جس کی وجہ سے بالخصوص رمضان اور عیدین کے بارے میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ اختلاف اگرچہ قرون اولیٰ سے چلا آرہا ہے لیکن دور حاضر میں ذرائع ابلاغ کی ترقی سے یہ اختلاف نہایت اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ اوراس کے حل کے لئے نئی نئی تجاویز سامنے آتی ہیں۔ اس سلسلے میں قابل غور باتیں حسب ذیل ہیں:

1۔ اس مسئلے کی نوعیت اوراس مسئلے کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

2۔ کیااس خواہش کی کوئی شرعی حیثیت یا بنیاد ہے کہ عالم اسلام میں عیدین اور رمضان کا آغاز ایک ہی روز ہو؟

3۔ کیا سعودی عرب کی رؤیت کواس کے لیے بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟

4۔ اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟

5۔ کیا رؤیت میں علم فلکیات سے کچھ مدد لی جاسکتی ہے؟

6۔ کیااس کی بنیاد پر پورے سال کا کلینڈر بنایا جاسکتا ہے؟

---

[1] مدیر شعبہ تحقیق وتالیف دارالسلام لاہور

7۔ جہاں موسم اکثر ابر آلود رہتا ہو اور وہاں رؤیت کا اہتمام ممکن ہی نہ ہو، ایسے ممالک میں رؤیت کا اثبات کس طرح ہوگا؟

8۔ فقہ حنفی کا مسئلہ اور پاک و ہند کے علماء احناف کا مؤقف۔

9۔ ایک علاقے کے لوگوں کا یہ مؤقف کہاں تک صحیح ہے کہ انہوں نے غیر سرکاری کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں اور وہ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے برعکس فیصلہ کر کے ایک یا دو روز پہلے ہی چاند کا اعلان کر دیتے ہیں؟

10۔ رؤیت کے اثبات کے لئے کتنے گواہ ضروری ہیں؟

11۔ وزارت مذہبی امور کی تجاویز جو چند سال قبل منظر عام پر آئی تھیں، ان کی حیثیت کیا ہے؟

12۔ اس مسئلے کے حل کے لئے کس قسم کے اقدامات کی ضرورت ہے؟

ہم نہایت اختصار سے اس مسئلے سے متعلق مسائل کا جائزہ بتوفیق الله وعونه پیش کرتے ہیں۔

نوعیت مسئلہ:

مہ وسال کا دارومدار بالاتفاق سورج کے بجائے چاند پر ہے لیکن کائنات کی وسعت کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک ہی روز مہ وسال کی ابتدا یا انتہا ناممکن ہے کیونکہ واقعاتی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مطالع کا بعد اور اختلاف اس قدر یقینی ہے کہ اس کا اعتبار کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، اس لئے شرعی دلائل کی رو سے ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہوں کے لیے معتبر نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کی رؤیت صرف اسی علاقے کے لوگوں کے لئے معتبر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(فمن شهد منكم الشهر فليصمه) (البقرة: 2:185)

''جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس کے (پورے) روزے رکھے''۔

اور اس مہینے کے روزے اسی پر فرض ہوں گے جو رمضان المبارک کا چاند دیکھے گا، رؤیت ہلال کے بغیر رمضان کا اس کی موجودگی میں تحقق ہی نہیں ہوگا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

''صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته ، فان غمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين ''

''تم چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھو (رمضان کا آغاز کرو) اور چاند دیکھ کر ہی روزہ افطار کرو (روزہ رکھنا ترک اور عید) کرو، اگر تم پر بادل چھائیں (اور اس کی وجہ سے چاند نہ دیکھ سکو) تو شعبان کے 30 دنوں کی گنتی پوری کرو۔[1]

---

[1] صحيح البخاری: الصوم ، باب قول النبی ﷺ اذا رأيتم الهلال فصوموا ------حديث 1909

اگر مثلاً: اہل مکہ یا اہل مصر چاند دیکھ لیں لیکن دوسرے علاقے کے لوگ اسے نہ دیکھ سکیں تو اہل مکہ یا اہل مصر کے لئے تو رؤیت ہوگئی اور وہ اس بنیاد پر رمضان کے آغاز یا اختتام کا فیصلہ کریں گے لیکن دوسرے علاقے کے لوگ کس طرح یہ فیصلہ کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے چاند دیکھا ہی نہ ہو۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک نظیر

علاوہ ازیں اس کی ایک دوسری وجہ عہدِ صحابہ کی ایک نذیر ہے جس سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ سطور میں پیش کیا گیا ہے۔۔۔۔وہ واقعہ حسب ذیل ہے:

''حضرت کریب رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ مجھے ام الفضل نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیجا۔ میں وہاں گیا اور اپنا کام پورا کیا اور ملک شام ہی میں میری موجودگی میں وہاں رمضان کا چاند ہو گیا اور یہ جمعہ کی رات تھی۔ پھر جب میں مہینے کے آخر میں مدینہ واپس آیا، تو مجھ سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ تم نے وہاں چاند کب دیکھا تھا، میں نے بتلایا کہ جمعے کی رات کو، انہوں نے پوچھا: تم نے خود دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں، میں نے بھی اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا اور اس کے مطابق ہی لوگوں نے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے روزے رکھے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لیکن ہم نے تو یہاں (مدینے میں) ہفتے کی رات کو چاند دیکھا تھا، چنانچہ ہم تو پورے تیس روزے رکھیں گے یا پھر (29 رمضان کو) ہم چاند دیکھ لیں۔ تو میں نے کہا: کیا آپ کے لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رؤیت اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح ہی حکم دیا ہے۔''[1]

صحیح مسلم کی احادیث کی تبویب کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ نے اس واقعے پر باب کا جو عنوان دیا ہے، اس کا ترجمہ ہی یہ ہے:

''اس بات کا بیان کہ ہر علاقے کے لئے ان کی اپنی رؤیت ہے، نیز یہ کہ جب کسی علاقے کے لوگ چاند دیکھ لیں تو رؤیت ان لوگوں کے حق میں ثابت نہیں ہوگی جو ان سے دور ہوں گے۔''

پھر امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

''وإنما رده لأن الرؤية لايثبت حكمها فى حق البعيد''

---

[1] صحیح مسلم: الصیام، باب بیان أن لكل بلد رؤيتهم و أنهم اذا رأوا الهلال ببلد لايثبت حكمه لما بعد عنهم

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت کریب رحمہ اللہ کی رؤیت کو اس لئے تسلیم نہیں کیا کہ رؤیت کا حکم دور والے لوگوں کے حق میں ثابت نہیں ہوتا۔''

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ واقعہ اپنی جامع ترمذی کے ابواب الصوم میں نقل کیا ہے اور انہوں نے بھی اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے: ''باب ماجاء لكل أهل بلد رؤيتهم'' ''اس بات کا بیان کہ ہر علاقے کے لوگوں کے لئے ان کی اپنی رؤیت ہے۔''

بہر حال اس میں واضح طور پر موجود ہے کہ صحابیء رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مدینہ والوں کے لئے شام کی رؤیت کا اعتبار نہیں کیا جس سے اسی مؤقف کا اثبات ہوتا ہے کہ پورے عالم اسلام کے لئے کسی ایک ہی علاقے کی رؤیت کافی نہیں ہے۔

اور احادیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''لاتصوموا حتىٰ تروا الهلال ولاتفطروا حتىٰ تروه فان أغمى عليكم فاقدروا له''[1]

''اور اس وقت تک روزہ نہ رکھو، جب تک چاند نہ دیکھ لو اور اس وقت تک روزہ افطار (روزہ رکھنا ترک اور عید) نہ کرو، جب تک چاند نہ دیکھ لو، اگر بادل چھا جائیں تو پھر (تیس دن کا) اندازہ پورا کرو۔''

اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ عیدین اگرچہ مسلمانوں کے ملی تہوار ہیں، لیکن یہ دوسرے مذاہب کے ملی تہوار نہیں، جن میں وہ لوگ تہوار کی سرمستی میں ہر چیز کو فراموش کر دیتے ہیں حتی کہ تمام اخلاقی قدروں اور ضابطوں اور تمام بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں عیدین کا آغاز بھی اللہ کی تکبیر اور تحمید اور اس کی بارگاہ میں دوگانہ ادا کر کے اس کے سامنے عجز و نیاز کے اظہار سے ہوتا ہے اور پھر کسی بھی مرحلے میں اس آزادروی کی اجازت نہیں ہے جس کا مظاہرہ عیدین کے موقعوں پر دوسرے لوگوں کی ویکھا دیکھی اور نقالی میں، جاہل مسلمانوں اور شریعت سے ناآشنا لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اللہ فراموش اور اخلاقی حدود سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں عیدین کی حیثیت ملی تہوار کے علاوہ عبادت کی بھی ہے۔ اور رمضان المبارک تو ہے ہی عبادات کا خصوصی مہینہ، اس لئے ان میں وحدت کا اہتمام غیر ضروری ہے۔ جس طرف عالم اسلام میں بلکہ ایک ملک میں بھی نمازوں کے اوقات میں فرق و تفاوت ہے اور اسے وحدت کے منافی نہیں سمجھا جاتا، تو عالم اسلام میں رؤیت ہلال کے حساب سے الگ الگ دن عیدین اور رمضان کے آغاز کو، عالم اسلام کی وحدت

---

[1] صحیح مسلم : الصيام ، باب وجوب صوم رمضان ۔۔۔۔حدیث 1080

کے منافی کیونکر سمجھا جائے؟ اپنے اپنے حساب سے ہر ملک میں الگ الگ عید منائی جاسکتی ہے اور رمضان کے روزے رکھے جاسکتے ہیں۔شریعت نے ایسا کوئی حکم دیا ہے اور نہ اس کا کوئی اہتمام ہی کیا ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ ایک ہی دن عید منائیں اور ایک ہی دن روزے رکھیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حکم دیا ہے:

''صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته''

''چاند دیکھ کر روزے رکھو(رمضان کا آغاز کرو) اور چاند دیکھ کر افطار(روزہ رکھنا ترک اور عید) کرو۔''

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک ہر ملک میں اس کے حساب سے رؤیت ہلال کا اثبات نہ ہوجائے ، نہ رمضان کا آغاز کرنا صحیح ہے اور نہ روزے ختم کر کے عید کا اہتمام کرنا مناسب ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں ایک ہی ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی رمضان اور عید کا الگ الگ اہتمام ہوسکتا ہے، بشرطیکہ رؤیت کے شرعی تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہو۔ اس کی کچھ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

جیسے ہر ملک اور علاقے میں جب تک صبح صادق نہ ہوجائے ، فجر کی نماز نہیں پڑھی جاسکتی اور جب تک سورج غروب نہ ہوجائے مغرب کی نماز نہیں پڑھی جاسکتی، اسی طرح رؤیت ہلال کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ بھی طلوع وغروب شمس کی طرح اختلاف مطالع کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے، اس میں نہ یکسانیت و وحدت پیدا کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا ہمیں کوئی حکم ہی دیا گیا ہے۔ چودہ صدیوں سے عالم اسلام میں اپنے اپنے حساب سے عیدین اور رمضان کا اہتمام ہوتا چلا آرہا ہے، اسے کبھی بھی وحدت و یک جہتی کے منافی نہیں سمجھا گیا۔اب ایسا کرنا کیوں کر وحدت کے منافی ہوجائے گا؟

بعض جلیل القدر علمائے احناف نے تو صرف پاکستان کی حد تک بھی ایک ہی دن عید منانے کو شرعی لحاظ سے غیر ضروری قرار دیا ہے۔۔۔۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ شرعی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ پورے ملک میں عید ایک ہی دن ہو۔ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اس وقت کے موجودہ ذرائع مواصلات کو بھی اس کام میں استعمال کرنے اور عید ایک ہی دن منانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا اور ملک کے وسیع وعریض ہونے کی صورت میں شدید اختلافِ مطالع کی مشکلات بھی اس میں پیش آسکتی ہیں۔لیکن پاکستان کے عوام اور حکومت کی اگر یہی خواہش ہے کہ عید پورے پاکستان میں ایک ہی دن ہو تو شرعی اعتبار سے اس کی بھی گنجائش ہے۔شرط یہ ہے کہ عید کا اعلان پوری طرح شرعی ضابطہ شہادت کے تابع ہو۔''[1]

---

[1] جوہر الفقہ، مفتی محمد شفیع مرحوم :397،398/1

اس تحریر پر مولانا محمد شفیع کے علاوہ، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا یوسف بنوری اور مولانا مفتی رشید احمد کے بھی دستخط ہیں اور یہ تحریر 1386ھ (آج سے 49سال پہلے) کی ہے۔

اس میں مذکورہ عبارت کے بعد شہادت کا وہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی چاند کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ہم نے یہ اقتباس صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ اس میں صرف ایک ملک کے اندر بھی عید کی وحدت کو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے۔(جو فی الواقع درست بھی ہے) چہ جائیکہ عالم اسلام میں ایک ہی دن عید کا اہتمام ضروری قرار دیا جائے۔اختلاف مطالع میں بہت زیادہ فرق کی صورت میں رؤیت ہلال میں جو مشکلات ہیں، اس کا بھی اعتراف ہے۔جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اختلاف مطالع میں بہت زیادہ فرق کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کسی ایک چھوٹے ملک کی حد تک، تو عیدین و رمضان میں وحدت کا اہتمام ممکن ہے اور صحیح بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ اس کے مختلف علاقوں میں مطالع کا اختلاف زیادہ نہیں ہوتا، تھوڑا بہت جو اختلاف ہے اسے نا قابل اعتبار قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جن ملکوں کے درمیان مطالع کا بہت زیادہ اختلاف اور فرق ہے، اسے کیونکر نا قابل اعتبار قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کے لئے جب تک کوئی معقول شرعی دلیل نہیں ہوگی، اسے تسلیم کرنا مشکل ہے۔

مذکورہ تفصیل سے مسئلے کی نوعیت بھی واضح ہوگئی اور وہ یہ کہ اسلامی مہینے کے لیے چاند کا دیکھا جانا ضروری ہے، اس کے بغیر مہینے کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا، یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس خواہش کی کوئی شرعی حیثیت یا بنیاد نہیں ہے کہ تمام عالم اسلام یا ایک وسیع اور بلاد بعید کے حامل ملک میں عیدین اور رمضان کا آغاز ایک ہی دن ہو۔

تیسرا، سعودی عرب کو بھی، جس کو عالم اسلام میں ایک خصوصی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے لئے بھی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟

مذکورہ تفصیل سے اگرچہ اس امر کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار ہے، یعنی دور دراز کے علاقوں کی رؤیت ان علاقوں کے لئے کافی نہیں ہے جن کے مطالع میں بہت زیادہ فرق ہے، مثلاً: ایک جگہ ظہر کا وقت ہے تو دوسری جگہ رات کا بھی کچھ حصہ گذر چکا ہے اور یوں چاند کے طلوع ہونے میں بھی اکثر و بیشتر ایک دن کا یا دو دن کا فرق واقع ہوجاتا ہے۔

لیکن چونکہ حنفی مذہب میں ظاہر الروایۃ کے مطابق اختلاف مطالع کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اس لئے

پاکستان کے بعض احناف کے نزدیک پورے عالم اسلام میں ایک ہی دن عید اور اور رمضان کا آغاز کیا جاسکتا ہے اور علمائے احناف کا یہ گروہ اسی پر زور دے رہا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ پاک و ہند کے حنفی علماء بھی اختلاف مطالع کا اعتبار کرنے کے قائل ہیں، یعنی وہ کسی ایک جگہ کی رؤیت کو پورے عالم اسلام کے لئے کافی نہیں سمجھتے۔ پاکستان کے جید علمائے احناف کی رائے پر مبنی ایک اقتباس ہم ''جواہر الفقہ'' سے نقل کر چکے ہیں جس میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ وحدت کے لئے ایک ہی دن عید منانا ضروری نہیں ہے۔ اب ہم ذیل میں ایک ہندوستانی حنفی عالم کی کتاب سے یہ بحث نقل کرتے ہیں جس میں انہوں حنفی فقہاء و علماء کی آراء نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار ہے اور بھارت کے تمام اہل سنت کے مکاتب فکر کا متفقہ فیصلہ بھی نقل کیا ہے جس میں اختلاف مطالع کو معتبر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اختلاف مطالع کی بحث

یہ مسئلہ گو اپنی نوعیت کے لحاظ سے قدیم ہے لیکن عصر حاضر کے اکتشافات، نیز تیز ذرائع مواصلات کی دریافت نے اسے پھر جدید مسائل کی فہرست میں داخل کر دیا ہے۔ ''مطلع'' کے معنی'' چاند کے طلوع ہونے کی جگہ'' کے ہیں۔ اس طرح ''اختلاف مطلع'' کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے مختلف خطوں میں چاند کے طلوع ہونے اور نظر آنے کی جگہ الگ الگ ہوا کرتی ہے، لہٰذا عین ممکن ہے کہ ایک جگہ چاند نمودار ہو اور دوسری جگہ نہ ہو۔ ایک جگہ ایک دن چاند نظر آئے اور دوسری جگہ دوسرے دن۔۔۔۔۔۔ اب یہاں دو سوالات ہیں:

ایک یہ کہ ''اختلاف مطلع'' پایا جاتا ہے یا نہیں؟

دوسرے اگر پایا جاتا ہے تو اس کا اعتبار بھی ہو گا یا نہیں؟

پہلا مسئلہ: اب نظری نہیں رہا بلکہ یہ بات مشاہدہ اور تجربہ کی سطح پر ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں مطلع کا اختلاف پایا جاتا ہے، اس کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بعض مقامات ایسے ہیں جن کے درمیان بارہ بارہ گھنٹوں کا فرق ہے۔ عین اس وقت جب ایک جگہ دن اپنے شباب پر ہوتا ہے تو دوسری جگہ رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی ہوتی ہے۔ ٹھیک اس وقت جب ایک مقام پر ظہر ہوتی ہے، دوسری جگہ مغرب کا وقت ہو چکا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں ان کا مطلع ایک ہو ہی نہیں سکتا۔ فرض کیجئے کہ جہاں مغرب کا وقت ہے، اگر وہاں چاند نظر آئے تو کیا جہاں ظہر کا وقت ہے وہاں بھی چاند

نظر آئیگا یا اس کو مغرب کا وقت تسلیم کرلیا جائیگا۔۔۔۔؟

<u>دوسرا مسئلہ</u> یہ ہے کہ: اس مطلع کا اختلاف معتبر بھی ہوگا یا نہیں؟ احناف کا مشہور مسلک یہی ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے، یعنی اگر مشرق کے کسی خطے میں چاند نظر آیا تو وہ مغربی خطوں کے باشندوں کے لئے بھی حجت ہوگا اور یہی رؤیت ان کے لئے عیدین اور رمضان ثابت کرنے کو کافی ہوگی۔

امام شافعی اور کچھ دوسرے فقہاء کے یہاں اس اختلاف مطالع کا اعتبار ہے اور ان کے یہاں ایک مقام کی رؤیت دوسرے مقام کے لیے بھی رؤیت اور چاند دیکھے جانے کی دلیل نہیں ہے۔ وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں لیکن ابن عباس کی جس روایت کو وہ اپنی دلیل بناتے ہیں وہ ان کے نقطہ نظر کے لئے صریح اور دوٹوک نہیں ہے، البتہ یہ بات بہت واضح ہے کہ نمازوں کے اوقات میں سبھی اختلاف مطالع کا اعتبار کرتے ہیں۔ اگر ایک جگہ ظہر یا عشاء کا وقت ہو چکا ہو اور دوسری جگہ نہ ہوا ہو تو جہاں وقت نہ ہوا ہو وہاں کے لوگ محض اس بناء پر ظہر یا عشاء کی نماز ادا نہیں کر سکتے کہ دوسری جگہ ان نمازوں کا وقت ہو چکا ہے یا اگر ایک جگہ مہینہ کا 28 واں ہی دن ہے اور دوسری جگہ 29 واں، جہاں چاند نظر آ گیا تو محض اس بناء پر 28 ویں ہی پر مہینہ کر کے اگلے دن رمضان یا عید نہیں کی جائیگی کہ دوسری جگہ چاند نظر آ گیا ہے۔

اس لئے یہ بات فطری اور انتہائی منطقی ہے کہ مطلع کے اختلاف کا اور اسی لحاظ سے رمضان اور عید کا اختلاف تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ فقہائے متقدمین کے دور میں اول تو معلوم کائنات کی یہ وسعت دریافت ہی نہ ہوئی تھی اور ممالک ہی نہیں کئی براعظموں سے دنیا بے خبر اور ناآشنا تھی، پھر اس میں بھی مسلمان جزیرۃ العرب اور خلیجی علاقوں میں محدود تھے، اس وقت تک شاید یہ بات ممکن رہی ہو اور ان کے مطلع میں اتنا فرق نہ رہا ہو کہ اس کو الگ الگ سمجھا جائے، اس لئے فقہا نے ایسا کہا ہے، چنانچہ خود فقہائے احناف میں بھی مختلف محققین نے اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحئ لکھنوی فرنگی محل نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور مختلف فقہا کی عبارتیں نقل کی ہیں جو یہاں ذکر کی جاتی ہیں، مشہور کتاب ''مراقی الفلاح'' کے مصنف لکھتے ہیں۔

''وقیل یختلف ثبوته باختلاف المطالع واختاره صاحب التجرید کما إذا زالت الشمس عند قوم وغربت عند غیرهم فالظهر علی الأولین لاالمغرب لعدم انعقاد السبب فی حقهم۔''

بعض حضرات کی رائے ہے کہ اختلاف مطالع کی وجہ سے رؤیت ہلال کے ثبوت میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ تجرید القدوری کے مصنف نے اسی کو ترجیح دی ہے جیسا کہ جب کچھ لوگوں کے یہاں آفتاب ڈھل جائے اور دوسروں کے یہاں غروب ہو جائے تو پہلے لوگوں پر ظہر ہے نہ کہ مغرب اس لئے کہ ان کے حق میں مغرب کا سبب محقق نہیں ہوا ہے۔"

نیز اسی کے حاشیہ پر علامہ طحطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وهو الا شبه لان انفصال الهلال من شعاع الشمس يختلف باختلاف الاقطار كما في دخول الوقت وخروجه ، وهذا مثبت فى علم الافلاک والهيئاة واقل مااختلف المطالع المطالع مسيرة شهركما فى الجواهر"

"یہی رائے زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ چاند کا سورج کی کرنوں سے خالی ہونا علاقوں کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے جیسا کہ اوقات (نماز) کی آمد و رفت میں۔ اور یہ فلکیات اور علم ہیئت کے مطابق ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، نیز کم سے کم جس سے اختلاف مطالع واقع ہوتا ہے، وہ ایک ماہ کی مسافت ہے جیسا کہ "جواہر" نامی کتاب میں ہے۔"

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

"اهل بلدة إذا رأو االهلال هل يلزم فى حق كل بلدة ؟ اختلف فيه فمنهم من قال لا يلزم... وفى القدورى إن كا ن بين البلدتين تفاوت لا ختلف به المطالع يلزمه"

"ایک شہر والے جب چاند دیکھ لیں تو کیا تمام شہر والوں کے حق میں رؤیت لازم ہو جائیگی؟ اس میں اختلاف ہے بعض لوگوں کی رائے ہے: لازم نہیں ہوگی ۔۔۔۔ اور قدوری میں ہے کہ اگر دو شہروں کے درمیان ایسا تفاوت ہو کہ مطلع تبدیل نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں رؤیت لازم ہوگی۔"

صاحب ہدایہ اپنی کتاب "مختارات النوازل" میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"اهل بلدة صاموا تسعة وعشرين يوما بالرؤية واهل بلدة اخرىٰ صاموا ثلاثين بالرؤية فعلى الاولين قضاء يوم إذا لم يختلف المطالع بينهما وأما إذا اختلفت لا يجب القضاء "

"ایک شہر والوں نے رؤیت ہلال کے بعد 29 روزے رکھے اور دوسرے شہر والوں نے چاند دیکھنے ہی کی بناء پر 30 روزے رکھے تو اگر ان شہروں میں مطلع کا اختلاف نہ ہو تو 29 روزے رکھنے والوں کو ایک دن کی قضاء کرنی ہوگی۔ اور اگر دونوں شہروں کا مطلع جداگانہ ہو تو قضا کی

ضرورت نہیں۔

محدث علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے کنز الدقائق کی شرح ''تبیین الحقائق'' میں اس پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔انھوں نے اختلاف مطالع کی بحث میں فقہائے احناف کا اختلاف نقل کرنے کے بعد خود جو فیصلہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

''الأشبه أن يعتبر لان كل قوم مخاطبو ن بما عندهم وانفصال الهلال عن شعا ع الشمس يختلف باختلاف المطالع كما فى دخول وقت الصلاة وخروجه يختلف باختلاف الاقطار ۔''

''زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اختلاف مطالع معتبر ہے، ۔اس لیے کہ ہر جماعت اسی کی مخاطب ہوتی ہے جو اس کو درپیش ہو اور چاند کا سورج کی کرنوں سے خالی ہونا مطالع کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے، جیسے نمازوں کے ابتدائی اور انتہائی اوقات علاقائی اختلاف کی بناء پر مختلف ہوتے رہتے ہیں۔''

پھر اس موضوع پر مفصل بحث کرنے کے بعد مولانا علامہ لکھنوی نے جو جچا تلا فیصلہ کیا ہے، وہ انھی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے۔

''اصح المذاہب عقلا ونقلا ہمیں است کہ ہر دو بلدہ کہ فیما بین آنہا مسافتے باشد کہ دراں اختلاف مطالع می شود وتقدیرش مسافت یک ماہ است، دریں صورت حکم رؤیت یک بلدہ بہ بلدہ دیگر نخواہد شد ودر بلادِ متقاربہ کہ مسافت کم از کم یک ماہ داشتہ باشند حکم رؤیت بلدہ بہ بلدہ دیگر لازم خواہد شد۔''[1]

''عقل ونقل ہر دو لحاظ سے صحیح مسلک یہی ہے کہ ایسے دو شہر جن میں اتنا فاصلہ ہو کہ ان کے مطلع بدل جائیں جس کا اندازہ ایک ماہ کی مسافت سے کیا جاتا ہے۔اس میں ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لئے معتبر نہیں ہونی چاہئے اور قریبی شہروں میں جن کے مابین ایک ماہ سے کم کی مسافت ہو ایک شہر میں رؤیت دوسرے شہر کے لئے لازم اور ضروری ہوگی۔''

راقم الحروف کے خیال میں یہ بات بہت معتدل، متوازن اور قرین عقل ہے، البتہ اختلاف مطالع کی حد یں متعین کرنے میں ''ایک ماہ کی مسافت'' کی قید کی بجائے جدید ماہرین فلکیات کے حساب اور ان کی رائے پر اعتماد کیا جانا زیادہ مناسب ہوگا۔

---

[1] مجموعة الفتاویٰ علی هامش خلاصة الفتاویٰ، جلد1، ص : 255،256

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ ، منعقدہ 4،3 ، مئی 1967ء کو مختلف مکاتب فکر کے علماء اور نمائندہ شخصیتوں نے مل کر اس مسئلہ کی بابت جو فیصلہ کیا تھا، وہ حسب ذیل ہے:

1۔ نفس الامر میں پوری دنیا کا مطلع ایک نہیں بلکہ اختلاف مطالع مسلم ہے۔ یہ ایک واقعاتی چیز ہے اس میں فقہائے کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

2۔ البتہ فقہاء اس باب میں مختلف ہیں کہ صوم اور افطار صوم کے باب میں یہ اختلاف مطلع معتبر ہے یا نہیں؟ محققین احناف اور علمائے امت کی تصریحات اور ان کے دلائل کی روشنی میں مجلس کی متفقہ رائے ہے کہ ''بلاد بعیدہ میں اس باب میں بھی اختلاف مطلع معتبر ہے۔''

3۔ بلاد بعیدہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں باہم اس قدر دوری واقع ہو کہ عادتاً ان کی رؤیت میں ایک دن کا فرق ہوتا ہے۔ ایک شہر میں ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہے اور دوسرے میں ایک دن کے بعد۔ ان بلاد بعیدہ میں اگر ایک کی رؤیت دوسرے کے لئے لازم کردی جائے تو مہینہ کسی جگہ 28 دن کا رہ جائے گا اور کسی جگہ 30 دن کا قرار پائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

4۔ بلاد قریبہ وہ شہر ہیں جن کی رؤیت میں عادتاً ایک دن کا فرق نہیں پڑتا، ایک ماہ کی مسافت کی دوری جو تقریباً 500 یا 600 میل ہوتی ہے کو بلاد بعید قرار دیتے ہیں اور اس سے کم کو بلاد قریبہ۔ مجلس اس سلسلے میں ایک ایسے چارٹ کی ضرورت سمجھتی ہے، جس سے معلوم ہو جائے کہ مطلع کتنی مسافت پر بدلتا ہے اور کن کن ملکوں کا مطلع ایک ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر حصوں اور بعض قریبی ملکوں مثلاً: نیپال وغیرہ کا مطلع ایک ہے۔ علمائے ہند و پاک کا عمل ہمیشہ اسی پر رہا ہے اور غالباً تجربہ سے بھی یہی ثابت ہے۔ ان ملکوں کے شہروں میں اس قدر بعد مسافت نہیں ہے کہ مہینے میں ایک دن کا فرق پڑتا ہو۔ اس بنیاد پر ان دونوں ملکوں میں جہاں بھی چاند دیکھا جائے، شرعی ثبوت کے بعد اس کا ماننا ان دونوں ملکوں کے تمام اہل شہر پر لازم ہوگا۔

5۔ مصر اور حجاز جیسے دور دراز ملکوں کا مطلع ہند و پاک کے مطلع سے علیحدہ ہے۔ یہاں کی رؤیت ان ملکوں کے لئے اور ان ملکوں کی رؤیت یہاں والوں کے لئے ہر حالت میں لازم اور قبول نہیں ہے، اس لئے ان میں اور ہند و پاک میں اتنی دوری ہے کہ عموماً ایک دن کا فرق ان میں واقع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات

اس سے بھی زیادہ۔[1]

کیا رؤیت میں علم فلکیات سے مدد لینا اور ان کی رائے کو اہمیت دینا جائز ہے؟

جائز ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چاند کے اثبات کے لئے رؤیت (چاند دیکھنا) ضروری ہے، اس کے بغیر چاند کا تحقق ممکن ہی نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ رصد وفلکیات کا جو علم ہے اور جو صدیوں کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے، اسے سرے سے کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے۔ بلکہ ہم جس طرح طلوع وغروبِ آفتاب، زوال اور طلوع فجر وغیرہ میں علم رصد پر اعتبار کرتے ہیں اور اسی علم کی بنیاد پر مذکورہ اوقات کا تعین کرتے اور انہیں تسلیم کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر دائمی اوقات نامے بنائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جب علم رصد کی رو سے غروب شمس کے وقت چاند کی ولادت ہی محقق نہ ہو، تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت چاند افق پر نظر آ جائے۔

اللہ تعالیٰ اگرچہ اسباب کا پابند نہیں ہے لیکن اس کی مشیت اور حکمت کے تحت نظام کائنات اسباب کے مطابق ہی چل رہا ہے۔ کائنات کی آفرینش سے لے کر آج تک اس میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ چاند کی ولادت اس کے وجود وظہور کا سبب ہے، جب تک یہ سبب (ولادت) نہ ہوگا، چاند افق پر نظر ہی نہیں آ سکتا۔ اور رصد وفلکیات کا علم اسی سبب کے جاننے کا نام ہے، وہ اس علم کی رُو سے چاند کی رفتار کا جائزہ لیتا ہے، اس کی ولادت کا تعین کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ افق پر کب ظاہر ہو سکتا ہے؟ اس لئے اس علم کا انکار کیا جا سکتا ہے نہ اس سے استفادے کو ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ جس طرح ہم طلوع وغروبِ آفتاب کے اوقات کے تعین میں اس علم پر اعتماد کرتے ہیں، ہمیں چاند کی ولادت وعدم ولادت اور اس کے امکانِ ظہور وعدم امکان ظہور میں بھی اس کی معلومات کو تسلیم کرنا چاہئے۔

بنابریں مسلمہ درایتی قواعد کی رو سے جس دن غروب آفتاب سے پہلے چاند کی ولادت نہ ہوگئی ہو۔ یا چاند اس دن سورج غروب ہونے سے پہلے غروب ہو چکا ہو تو اس دن یقیناً چاند نظر آنے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ لیکن اس دن اگر کچھ لوگ دعویٰ کریں کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے تو ان کا یہ دعویٰ سخت محل نظر ہوگا کیونکہ یہ دعویٰ ایسا ہی ہوگا جیسے سورج غروب ہو چکا ہو لیکن دعویٰ کرنے والے دعویٰ کریں کہ ابھی غروب

---

[1] جدید فقہی مسائل، جلد 1 ص: 94،89۔ تالیف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (فاضل دیوبند) صدر مدرس دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد دکن (بھارت)

نہیں ہوا۔ یا سورج نکل چکا ہو لیکن دعویٰ کرنے والے دعویٰ کریں کہ سورج ابھی نہیں نکلا۔ ایسی صورت میں یقیناً رؤیت ہلال کا دعویٰ کرنے والوں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرنی چاہیے۔ اور شہادت کے شرعی تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے، چاہے اس کی روشنی میں پہلا فیصلہ غلط قرار پائے، اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

اہل خیبر (سرحد) کا معاملہ؟

یہ ایک نہایت قابل غور معاملہ ہے کہ ہر سال مسئلہ صرف صوبہ خیبر پختون خواہ کے لوگوں کی وجہ سے اختلاف وافتراق کا باعث بنتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟۔۔۔دوسرے صوبوں میں ایسا کیوں نہیں ہوتا؟

اس کی وجہ بعض لوگ علمائے اہل خیبر کا دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ دین دار ہونا بتلاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بہت سے ذمہ دار حضرات یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں بعض علاقے ایسے ہیں کہ وہ یوں ہی شور مچا دیتے ہیں: ''چاند ہوگیا اور کل عید ہے یا روزہ ہے'' راقم جب مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کا رکن تھا تو صوبہ خیبر کے دو نمائندے اس میں شامل تھے، وہ دونوں اختلاف مسلک کے باوجود اس بات پر متفق تھے کہ رؤیت ہلال کے بارے میں صوبہ خیبر کے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی چاند ہونے کا اعلان کردیتے ہیں۔

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے سابقہ چیئرمین مولانا عبداللہ صاحب نے ایک مرتبہ خود اس امر کا ذاتی مشاہدہ حاصل کیا تھا۔ ان کا بیان ہے 29 شعبان 1418ھ کو، جبکہ سرحد میں یکم رمضان تھی اور وہاں 28 شعبان کو 30 آدمیوں نے چاند دیکھنے کی شہادت دی تھی اور اسی بنا پر وہاں مقامی کمیٹی نے روزے رکھنے کا اعلان کیا تھا۔ میں نے وہاں کے بعض علماء سے کہا کہ آج آپ کے حساب سے رمضان کی دوسری رات ہے اور آج چاند واضح اور صاف نظر آنا چاہیے۔ جبکہ فلکیات والوں کا کہنا یہ تھا کہ آج چاند بلوچستان اور سندھ کے بعض علاقوں میں ممکن ہے نظر آجائے، اس کے علاوہ کہیں نظر آنے کا امکان نہیں ہے، چنانچہ میں ان علمائے سرحد کو لے کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا، ہمارے ساتھ سینکڑوں آدمی اور بھی تھے، لیکن بسیار کوشش کے باوجود چاند نظر نہ آیا۔ بلکہ پورے سرحد سمیت کہیں بھی نظر نہ آیا اور تھوڑی دیر بعد صرف بلوچستان سے چاند دیکھے جانے کی اطلاع ملی، جسکی بنیاد پر مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی نے چاند کے ہونے کا فیصلہ اور اعلان کیا۔ اس ایک واقعے نے دونوں باتوں کا فیصلہ کردیا۔

1۔ رؤیت ہلال کے بارے اہل سرحد کی گواہی معتبر نہیں اور جو علماء مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی اور اس کے طریقہ کار سے ہٹ کر اپنے طور پر رؤیت کا فیصلہ کرتے ہیں، صحیح نہیں ہے اور ان کا یہ طرز عمل مستقل انتشار واختلاف کا باعث ہے۔

2۔ اہل فلکیات کی رائے کو قرار واقعی اہمیت نہ دینا بھی غلط ہے۔ فلکیات کا یہ علم صدیوں کے مسلسل تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے، اس سے استفادہ کرنا اور اس سے وابستہ افراد کی رائے کو اہمیت دینا ضروری ہے، نیز اس کا شریعت سے کوئی تصادم بھی نہیں ہے، اس لیے ان کی رائے کو آسانی سے جھٹلانا ناممکن ہے، نہ جھٹلانے کی ضرورت ہی ہے، البتہ اگر کبھی (کسی نادر صورت میں) واقعی اہل فلکیات کی رائے مشاہدے کے خلاف ہو تو مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی قرائن وشواہد اور گواہوں، گواہیوں کی حیثیت کا تعین کر کے اس کے خلاف فیصلہ سنا سکتی ہے۔ یہ نہ کوئی مشکل بات ہے، نہ اس سے فلکیات کی بے اعتباری کا اثبات ہوتا ہے۔ (از مکتوب مولانا عبداللہ مرحوم بنام علمائے کرام)

پس چہ باید کرد

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اہل خیبر کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی رؤیت نہ مطلقاً قابل تسلیم ہے اور نہ قابل رد، ان کا رویہ جو قابل اصلاح ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے متوازی جو غیر سرکاری کمیٹی یا کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں، ان کو ختم کر دیا جائے یا وہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند کریں کہ ان کے سامنے رؤیت کی جو گواہیاں آئیں، اگر وہ ان سے مطمئن ہوں تو پہلے مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کو، اگر اس کا اجلاس ہو رہا ہو، ان سے آگاہ کریں، وہ یقیناً ان پر غور کرے گی، بلاوجہ وہ اس کو رد نہیں کرے گی جیسا کہ راقم کو ذاتی طور پر اس کے طریقہ کار سے آگاہی ہے۔ اس نے پہلے بھی اہل خیبر کی رؤیت پر بعض دفعہ فیصلہ کیا ہے، جبکہ ان کی گواہی شہادت کے شرعی تقاضوں پر پوری اتری ہے۔ اور اگر ملک کے دوسرے حصوں میں 28 تاریخ ہو جیسا کہ بدقسمتی سے ایک عرصے سے یہ صورت حال چلی آ رہی ہے تو کوئی صورت ایسی بنائی جائے کہ جب تک یہ صورتحال موجود ہے مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ہنگامی طور پر اپنے اراکین سے موبائل فون پر رابطہ کر کے ایک دوسرے کی رائے حاصل کرنے کی کوشش کرے، آج کل اس طرح فوری رابطہ کر کے فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ بصورت دیگر صوبہ خیبر کے علماء کی کمیٹی اگر پوری طرح مطمئن ہو تو وہ خیبر کی حد تک رؤیت کا فیصلہ کر دے، تاہم اس کے لئے تین باتوں کا اہتمام ضروری ہے۔

اول: یہ کہ یہ کمیٹی تمام مکاتب فکر کے علماء پر مشتمل ہو۔

دوم: سرکاری مداخلت سے آزاد ہو۔

سوم: اگر دوسرے روز خیبر میں بھی (جب کہ دوسرے حصوں میں 29 اور سرحد میں یکم تاریخ ہو) چاند افق پر نظر نہ آئے تو واضح طور پر اپنی غلطی کا اعتراف و اعلان کرے اور آئندہ کے لئے مکمل طور مرکزی کمیٹی کے فیصلے کی پابندی کا اہتمام کرے۔

راقم کو امید ہے کہ ایک دو مرتبہ اس طرح کرنے سے آئندہ کے لئے ایک واضح صورت متعین ہو جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اہل خیبر کے معاملے کو خیبر کے علماء ہی کے سپرد کر دیا جائے، وہ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں اور اس پر عمل کریں جیسا کہ سالہا سال سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور اہل خیبر اکثر اپنے صوبے کی رؤیت اور اپنے لوگوں کی شہادتوں پر اعتماد کرتے ہوئے ملک کے دوسرے حصوں سے الگ ہی رمضان اور عید کا اہتمام کرتے ہیں، ایسا کرنے کی بھی شرعاً پوری گنجائش ہے۔

اثبات ہلال کے لئے کلینڈر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے

مذکورہ وضاحت سے اس امر پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ کلینڈر پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ بعض لوگ وحدت و یکجہتی کے نقطہ نظر سے پورے عالم اسلام کے لئے ایک اسلامی کیلنڈر کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ یہ تجویز نیک نیتی پر مبنی ہو سکتی ہے لیکن یہ نصوص شریعت سے متصادم ہے کیونکہ اولاً روزہ یا عید الفطر کا اہتمام ایک عبادت ہے۔ یہ دوسری قوموں کی طرح کے صرف ایک تہوار نہیں ہیں بلکہ اصلاً یہ عبادات ہیں تاہم ان میں اجتماعیت کا اہتمام کیا گیا ہے ۔لیکن یہ اجتماعیت اسی حد تک ممکن ہوگی جس حد تک نصوص شریعت اجازت دیں گی، جیسے ایک علاقے کے لوگ ایک ہی وقت میں روزے کا آغاز یا اختتام کریں، عیدین کی نماز کھلے گراؤنڈ میں ادا کریں، وغیرہ۔لیکن اس اجتماعیت کو اس حد تک نہیں بڑھایا جاسکتا کہ پورے عالم اسلام کو یا کسی وسیع ایک ملک کو کسی ایک علاقے کی رؤیت کا پابند کر دیا جائے یا ایک حسابی کلینڈر بنا دیا جائے جس میں فلکیات کے اعتبار سے رمضان، شوال اور ذی الحجہ اور دیگر اسلامی مہینوں کے آغاز کا تعین کر دیا جائے اور پورے عالم اسلام کو اس کے مطابق مہینوں کے آغاز و اختتام کا پابند بنا دیا جائے۔ ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح اجتماعی طور پر عیدین وغیرہ کو بطور تہوار منانے کے جذبے کی توسیع ہو جائے گی لیکن ایسا کرنا نصوص شریعت سے متصادم ہوگا۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر

ہی افطار کرو، یعنی روزہ رکھنا چھوڑ دو، اسی حدیث میں آگے یہ الفاظ ہیں: ’’فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین‘‘ اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے 30 دن پورے کرو۔‘‘[1]

گویا چاند کا دیکھا جانا ضروری ہے کیونکہ مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں یہ امکان بھی یقیناً موجود ہے کہ چاند موجود ہو لیکن نظر نہ آ سکے لیکن امکان کو اہمیت نہیں دی گئی بلکہ رؤیت ہی کو اصل قرار دیا گیا۔ اس سے اسی امر کی تائید ہوتی ہے کہ محض فلکیات کی بنیاد پر ایسا کلینڈر بنانا جائز نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر پورا عالمِ اسلام ایک ہی دن رمضان، شوال اور ذی الحجہ وغیرہ کا آغاز کرے کیونکہ اس حسابی کلینڈر کی بنیاد امکان، تخمینہ اور غیر یقینی علم پر ہوگی جبکہ حکم رؤیت (دیکھنے) کا اعتبار کرنے کا ہے۔

بنا بریں عیدین وغیرہ کسی نہ کسی اعتبار سے ملی تہوار ضرور ہیں لیکن اصلاً یہ عبادات ہیں، جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں جو سب سے اہم عبادت ہے لیکن کسی کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ اس میں ایسی اجتماعیت ہونی چاہیے کہ ایک ہی وقت میں پورے عالم اسلام میں ہر نماز پڑھی جائے کیونکہ مطالع کے اختلاف کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح سے رمضان اور عیدین وغیرہ کا معاملہ ہے، مطالع کے اختلاف کی وجہ سے پورے عالم اسلام کے لئے ایک کلینڈر نہیں بنایا جا سکتا۔

عہد صحابہ کے اس واقعے سے بھی، جو پہلے حضرت کریب رحمہ اللہ کا گذر چکا ہے، اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ مطالع مختلف ہونے کی صورت میں اپنے اپنے علاقے ہی کی رؤیت ضروری ہوگی، یا زیادہ سے زیادہ ایک ملک کے لئے کافی ہوگی، بشرطیکہ اس کے مختلف صوبوں اور حصوں کے مطالع میں زیادہ اختلاف نہ ہو، کسی دور دراز کے ملک کی رؤیت، جس کا مطلع اور نظام الاوقات مختلف ہو، دوسرے علاقوں کے لئے قابل اعتبار نہیں ہوگی۔ یہ واقعہ صحیح مسلم میں ہے۔

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب مطالع میں زیادہ اختلاف ہو تو ایک کی رؤیت دوسرے کے لیے معتبر نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے شام کی رؤیت کو اہل مدینہ کے لئے ناکافی سمجھا اور اس امر کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف فرمایا۔

جن ممالک کے مطالع مختلف نہ ہوں، وہ ایک دوسرے کی رؤیت کا اعتبار کر سکتے ہیں

البتہ ایسے قریبی ممالک جن کے مطالع میں زیادہ اختلاف نہ ہو اور وہ رؤیت والے ملک کے مغرب

[1] صحیح البخاری، الصوم، حدیث 1909

میں واقع ہوں تو وہ اس کی رؤیت پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے، چنانچہ ایک سعودی عالم و مفتی شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین رحمہ اللہ (متوفی جولائی 2009ء) تحریر فرماتے ہیں: ''شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی رائے یہ ہے کہ جن ممالک میں چاند دیکھا گیا اور جو ممالک ان سے آگے ہیں، یعنی مغرب کی جانب ہوں۔ ان سب پر روزہ رکھنا فرض ہوگا اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جب کسی ایک ملک میں چاند دیکھا گیا ہو تو ضروری ہے کہ اس کے بعد والے ممالک میں بھی چاند نظر آئے گا، اس لیے کہ چاند سورج کے بعد غروب ہوتا ہے اور جیسے جیسے اس میں تاخیر ہوگی چاند سورج سے دور ہوتا چلا جائیگا اور زیادہ واضح اور ظاہر ہوتا چلا جائیگا۔ مثال کے طور پر اگر بحرین میں چاند دیکھا گیا تو ان ممالک کے لوگوں پر بھی روزہ رکھنا واجب ہو جائیگا جو اسکے بعد جیسا کہ نجد، حجاز، مصر اور مغرب (مراکش وغیرہ) ہیں مگر جو ممالک بحریں سے پہلے واقع ہیں، مثلاً: ہندوستان، سندھ اور ماوراء نہر (روس کے بالائی علاقے) کے ممالک، ان ملکوں کے لوگوں پر روزہ واجب نہیں ہوگا۔''[1]

امام ابن تیمیہ کی رائے پر مبنی اس اقتباس میں مثال دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ اس طرح کے ممالک کا مطلع ایک ہوسکتا ہے اور وہاں سب ممالک کسی ایک ملک کی رؤیت پر رمضان، شوال وغیرہ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

رؤیت کے اثبات کے لیے کتنے گواہ ضروری ہیں؟

احادیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور چاند دیکھ کر ہی افطار یعنی عید کرنے کا حکم ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا ہر ہر مسلمان کا دیکھنا ضروری ہے یا کتنے مسلمانوں کا دیکھنا کافی ہے؟

یہ بات تو واضح کی جا چکی ہے کہ جن ممالک کے مطالع ایک ہیں یا ان میں زیادہ فرق نہیں ہے، وہ ایک دوسرے کی رؤیت کی بنیاد پر رمضان وشوال وغیرہ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ رؤیت کا اثبات کس طرح ہوگا؟ ظاہر بات ہے کہ ہر شخص کو تو دیکھنے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے علماء کے ایک گروہ کی رائے تو یہ ہے کہ ایک عادل مسلمان کی گواہی سے رؤیت کا اثبات ہو جائیگا امام شوکانی اور صاحبِ ''فقہ السنہ'' وغیرہ نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے علماء کی رائے ہے کہ رمضان المبارک کے لئے ایک عادل مسلمان کی گواہی اور رمضان کے علاوہ دیگر مہینوں (شوال، ذی الحجہ وغیرہ) کے لیے دو عادل گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔ شرعی

---

[1] فتاویٰ الصیام، ص:72، طبع دارالسلام

نصوص کی رُو سے یہ دوسری رائے راجح ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

'' تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم، أنى رأيته فَصَامَ وَ أَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ ''

''لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی (لیکن میرے سوا کسی کو نظر نہیں آیا) چنانچہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔''[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رمضان المبارک کے لئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے۔ امام ابوداؤد نے بھی جو باب باندھا ہے اس کا ترجمہ بھی یہ ہے کہ:

''رمضان کے چاند کے اثبات کے لئے ایک شخص کی گواہی کا بیان۔'' اور اس کے تحت مذکورہ حدیث بیان کی ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اور اس باب سے پہلے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے باب باندھا ہے۔ ''باب شهادة رجلين علىٰ رؤية هلال شوال'' ''شوال کے چاند کے اثبات کے لئے دو آدمیوں کی گواہی کا بیان'' اور اس کے تحت امیر مکہ حارث بن حاطب کا یہ واقعہ بیان کیا ہے:

'' ان امير مكه خطب ثم قال: عهد الينا رسول الله ﷺ أن ننسک للرؤيته، فان لم نره و شهد شاهداعدل نسكنا بشهادتهما''

''امیر مکہ نے خطاب کیا اور اس میں اس نے یہ بھی کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم چاند دیکھ کر حج کے ارکان ادا کریں۔ اگر ہم خود نہ دیکھ سکیں اور دو عادل گواہ گواہی دے دیں تو ہم ان کی گواہی پر حج کر لیں۔''

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ امیر مکہ نے یہ بھی کہا کہ ''اس مجلس میں بلاشبہ ایسی شخصیت موجود ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے متعلق مجھ سے زیادہ باخبر ہے۔'' اور یہ کہہ کر انہوں نے اس شخصیت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ شخصیت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تھی، ان سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ''بِذٰلِکَ أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ '' ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اسی بات کا حکم دیا ہے۔''

---

[1] سنن ابی داؤد ،الصيام ، باب فی شهادة الواحدعلى رؤية هلال رمضان، حديث 2340

امام ابوداؤد نے ایک دوسری روایت یہ بیان کی ہے کہ ربعی بن حراش ایک صحابی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"اختلف الناس فی آخر یوم من رمضان، فقدم اعرابیان فشهدا عندالنبی ﷺ باللهِ لأهلا الهلال أمس عشية ، فأمر رسول الله ﷺ الناس أن يفطرو ا، زاد خلف فی حديثهِ : وان يغدوا إلى مصلاهم"

"رمضان کے آخری دنوں کی بابت لوگوں کا اختلاف ہو گیا تو دو اعرابی (دیہاتی) آئے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ انہوں نے (گاؤں سے مدینہ آتے ہوئے) کل شام کو چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ روزے توڑ لیں۔ اور حدیث کے ایک راوی خلف کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ نے حکم فرمایا: "اگلے دن صبح کو (نماز عید کے لیے) عیدگاہ جائیں۔"

یہ دنوں حدیثیں (2339،2338) سنن ابو داؤد کے باب میں موجود ہیں جس کا حوالہ پہلے گزرا ہے۔ پہلی حدیث میں دو گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کرنے کا حکم ہے اور دوسری حدیث میں دو گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کرنے کی عملی مثال ہے۔ پہلی حدیث میں حج کے ارکان کی ادائیگی، یعنی ذی الحجہ کے چاند کی صراحت ہے اور دوسری حدیث میں ہلال شوال کا ذکر ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ رمضان المبارک کے چاند کے علاوہ دیگر مہینوں کے اثبات کے لئے دو عادل مسلمان گواہوں کی گواہی ضروری ہے اور رمضان کے لئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے۔

عادل، جس کی گواہی معتبر ہے، کون ہے؟

عادل کا مطلب ہے وہ مسلمان، متقی، احکام وفرائض اسلام کا پابند ہو اور کوئی واضح جرح اس پر ثابت نہ ہو۔ دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شوال کے چاند کی معتبر گواہی اگر تاخیر سے ملے تو روزے اسی وقت توڑ دئے جائیں اور نماز عید کا وقت نکل چکا ہو تو نماز عید اگلے دن ادا کی جائے۔

اگر کسی ملک میں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہو تو۔۔۔؟

1979ء میں سنگاپور میں وہاں کی جمعیت دعوت اسلامی اور ایک دوسری تنظیم اسلامی کونسل کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہوا۔ جمعیت کی رائے میں ماہ رمضان کی ابتداء اور انتہا ادلہ شرعیہ کے عموم کے مطابق ہونی چاہیے جبکہ سنگاپور اسلامی کونسل کی رائے تھی کہ رمضان کی ابتداء اور انتہا فلکیات کے حساب کے مطابق ہونی چاہیے کیونکہ اس وقت ایشیا کے ممالک کا مطلع عموماً اور سنگاپور کا مطلع خصوصاً ابر آلود تھا، لہٰذی اکثر

ممالک میں رؤیت کے مقامات ابر آلود ہونے کی وجہ سے یہ ایک ایسا عذر ہے کہ جس کی وجہ سے فلکیات کے حساب (کلنڈر) پر انحصار کیے بغیر چارہ نہیں۔

یہ مسئلہ سعودی عرب کی فقہی کونسل میں جس میں کبار علماء شامل ہیں، پیش ہوا، اسلامی فقہی کونسل کے ارکان نے نصوص شرعیہ کی روشنی میں اس موضوع کا خوب مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں جمعیت دعوت اسلامی کی تائید کی کیونکہ اس کی تائید میں شرعی دلائل واضح طور پر دلالت کناں ہیں۔

اسلامی فقہی کونسل کی رائے ہے سنگاپور اور ایشا کے بعض دیگر ممالک جہاں عموماً مطلع ابر آلود رہتا ہے اور ان جیسے علاقوں میں مسلمانوں کے لئے چاند دیکھنا ممکن نہیں ہوتا، انہیں چاہیے کہ اس سلسلے میں اسلامی ملکوں پر اعتماد کریں جو چاند کے سلسلے میں کسی حساب کے بجائے صرف اور صرف رؤیت پر اعتماد کرتے ہیں تا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل ہو سکے کہ ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار (روزہ رکھنا ترک اور عید) کرو۔[1]

اس فتوی کی رو سے ایسے علاقوں کے لوگوں کے لئے جہاں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہے اور چاند کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا، ایسے علاقوں کی رؤیت کے مطابق رمضان وشوال کا آغاز کرنا جائز ہے جہاں شریعت کے مطابق رؤیت بصری پر فیصلہ کیا جاتا ہے، جیسے سعودی عرب پاکستان وغیرہ ہیں، گویا محض فلکیات پر اعتبار کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح شرعی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔

ہمیشہ 30 روزے رکھنا بھی جائز نہیں

علاوہ ازیں ایسے علاقوں کے لوگوں کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ یہ سوچ کر کہ ہمیں تو چاند نظر نہیں آتا، ہمیشہ 30 روزے رکھتے رہیں اور کسی بھی ملک کی رؤیت بصری پر اعتماد نہ کریں کیونکہ اس طرح بھی قانون الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی ہے، اس لئے کہ مہینہ اللہ ہی کے حکم سے کبھی 29 دن کا اور کبھی 30 دن کا ہوتا ہے اور وہ دنوں کی اس کمی بیشی کو اپنے طور پر ختم کردیں تو یہ یقیناً حدود الٰہی سے تجاوز ہوگا۔

''وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'' (البقرۃ:2/229)

---

[1] فتاویٰ اسلامیہ: 2/159،160، مطبوعہ دار السلام۔

ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرنے سے روزے 30 / 29 کے بجائے کم یا زیادہ ہوجائیں؟

مذکورہ تفصیل سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے جو بعض ایسے لوگ پوچھتے ہیں جن کو رمضان المبارک میں ایک ملک سے دوسرے ملک آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے، ان کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ بعض دفعہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں رمضان کے آغاز یا اختتام پر آتے یا جاتے ہیں تو ان کے روزے 28 رہ جاتے ہیں یا بعض دفعہ 31 ہو جاتے ہیں ۔ وہ کیا کریں؟ تو حکم یہی ہے کہ جس ملک میں بھی جائیں اگر وہاں ابھی رمضان ختم نہیں ہوا ہے تو وہاں جانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھیں، چاہے وہ سفر کرنے سے پہلے اپنے ملک میں اس ملک سے ایک یا دو دن پہلے روزے رکھ چکے ہوں، اس طرح امکان ہے کہ ان کے روزے 30 کے بجائے 31 ہوجائیں، لیکن ان کے لیے وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ہی عیدالفطر کرنی ضروری ہوگی، اس سے پہلے وہ روزہ رکھنا ترک نہیں کریں گے۔ ان کا ایک زاید روزہ ان کے لئے نفلی ہوجائیگا۔ اسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ جب وہ دوسرے اسلامی ملک میں جائیں تو وہاں ہلال شوال نظر آجائے جبکہ ان کے روزے 28 ہی ہوں، اس صورت میں بھی ان لئے عیدالفطر ان کے ساتھ ہی کرنی ضروری ہوگی اور یہ ایک روزے کی بعد میں قضاء دے لیں گے۔

اور اگر 29 روزے پورے ہوجائیں تو پھر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، ان کے روزے پورے رمضان کے روزے ہی شمار ہوں گے کیونکہ مہینہ کبھی 29 دن کا بھی ہوتا ہے، البتہ 28 یا 31 دن کا نہیں ہوسکتا۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے دن لمبا ہوجائے، مثلاً ایک شخص روزے کی حالت میں غروب شمس کے قریب سفر کا آغاز کرتا ہے لیکن وہ جس ملک کی طرف سفر کررہا ہے وہاں سورج تاخیر سے غروب ہوتا ہے، بنا بریں اسکا دن گھنٹہ یا دو گھنٹے لمبا ہوجائے، تو ظاہر بات ہے وہ راستے میں روزہ اسی وقت افطار کرے گا جب سورج کے غروب ہونے کا یقین ہوجائے گا چاہے اپنے ملک کے مقابلے میں اس کا روزہ کچھ لمبا ہوجائے۔ علاوہ ازیں اس کے برعکس دن چھوٹا بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں اس کو سہولت مل جائے گی اور معمول سے کچھ دیر پہلے روزہ افطار کرلے گا۔

گویا جس طرح روزہ افطار کرنے کے لئے غروب شمس کا تیقُن ضروری ہے چاہے دن کچھ لمبا یا چھوٹا ہوجائے اسی طرح ایک مسلمان جس ملک میں بھی جائے گا، وہاں کی رؤیت کے مطابق ہی اسے عیدالفطر کرنی ہوگی،

یعنی روزہ رکھنے یا چھوڑنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر وہاں کی رؤیت پر اس کے روزے پورے 29 یا 30 ہوجائیں تو فبہا اور اگر 31 ہوجاتے ہیں تو ایک روزہ نفلی ہوجائے گا۔لیکن وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھنا ضروری ہوگا اور 28 ہوں گے تو ایک روزہ عیدالفطر کے بعد رکھنا ہوگا کیونکہ حکم ہے:

''اَلصَّوم يومُ تَصُومُونَ، وَالفِطرُ يومَ تُفطِرُونَ، وَالاضحى يومَ تضحُونَ''

''روزے کا دن وہ ہے جس دن تم روزہ رکھو اور روزہ افطار (عید) کرنے کا وہ دن ہے جس دن تم افطار (عید) کرو اور عیدالاضحیٰ کا وہ دن ہے جس دن تم قربانیاں کرو۔''[1]

اس حدیث میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور مسلمانوں سے مراد اپنے اپنے علاقے (یا ایک متحد المطالع ملک) کے مسلمان ہیں، اس میں ایک علاقے کی حد تک مسلمانوں کو اجتماعیت کی تاکید ہے جس سے مسئلہ زیر بحث کی تائید ہوتی ہے۔

کچھ رؤیت ہلال کمیٹی اور اس کی پیش کردہ تجاویز کے بارے میں

اب آخر میں ہم دو امور پر مزید گفتگو کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

1۔ وقتاً فوقتاً مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلوں اور طریقہ کار پر تنقید ہوتی رہتی ہے، اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا جواز ہے یا نہیں؟

2۔ رؤیت ہلال کمیٹی کو مزید بہتر کس طرح بنایا جاسکتا ہے اور اس کے لئے کیا مزید اقدامات کئے جانے چاہئیں؟

بعض حلقوں کی طرف سے بلکہ چند سال قبل خود وزارت مذہبی امور کی طرف سے یہ تجویز منظر عام پر آئی تھی کہ رؤیت ہلال کمیٹی کا وجود ختم کردیا جائے اور یہ معاملہ خود وزارت مذہبی امور سنبھال لے اور وہی علماء کے فیصلے کے بغیر رؤیت یا عدم رؤیت کا اعلان کرے، البتہ ایک اطلاعاتی مرکز قائم کیا جائے جس میں تمام جدید سائنسی آلات اور سہولیات موجود ہوں۔ وزارت مذہبی امور اس کی مدد سے چاند دیکھنے اور اس کا فیصلہ کرنے کا اہتمام کرے۔

3۔ سعودی عرب کو حرمین مقدسین کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں عزت و احترام کا ایک خاص مقام حاصل ہے، پاکستان میں اس کی رؤیت اور فیصلے کو بنیاد بنا لیا جائے اور اس کے مطابق ہی یہاں رمضان کے آغاز کا اور عیدین منانے کا اہتمام کیا جائے۔

---

[1] جامع الترمذی ، الصوم، باب ماجاء أن الصوم يوم تصومون ۔۔۔۔حدیث 697

یہ اتحاد امت کی اچھی مثال بن سکتی ہے۔۔وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے خیال میں وزارت مذہبی امور کی مذکورہ دونوں ہی تجویزیں نہ صرف درست نہیں بلکہ قابل عمل بھی نہیں !!

جہاں تک پہلی تجویز کا تعلق ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلے سے علمائے کرام کا تعلق ختم کر دیا جائے اور یہ معاملہ کلیتاً حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔لیکن اس سے مسئلہ سلجھے گا نہیں،مزید الجھے گا،اس لئے کہ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے جس میں رہنمائی کے لئے عوام دینی رہنماؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کریں گے کیونکہ وہ شرعی مسئلے میں حکومت پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں۔

خود مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے قیام کا پس منظر بھی یہی ہے کہ ایوب خان کے دور میں ایک دو مرتبہ حکومت نے اپنے اعلان کے مطابق عید منوانے کی کوشش کی جو بری طرح ناکام ہوئی اور عوام نے علماء کی رائے پر ہی مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔اس تجربے کی روشنی میں بالآخر حکومت نے رؤیت ہلال کمیٹی قائم کی اور یہ معاملہ کلیتاً اس کمیٹی کے ذریعے سے علماء کے سپرد کر دیا۔رؤیت ہلال کے قیام کے بعد یہ معاملہ نہایت خوش اسلوبی سے چل رہا ہے کمیٹی کے فیصلے میں بعض دفعہ تاخیر ہو جاتی یا اس کا فیصلہ ہدف تنقید بنتا ہے،تو اس کی وجہ صاف ظاہر ھے کہ یا تو حکومت کے ناقص انتظامات تاخیر کا سبب بنتے ہیں یا ناقص اطلاعات اس کا باعث بنتی ہیں۔اصل ضرورت ان وجوہات کا خاتمہ ہے جن سے تاخیر ہوتی ہے یا فیصلہ ہدف تنقید بنتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ رؤیت ہلال کمیٹی کا وجود تحلیل کر دینا چاہیے جس کا کوئی قصور نہیں،کیونکہ کمیٹی کا کام صرف چاند دیکھنا نہیں ہے بلکہ ’’چاند دیکھے جانے یا نہ دیکھے جانے کا فیصلہ کرنا ہے۔‘‘ اور کمیٹی اپنا یہ کام یعنی رؤیت کا فیصلہ کرنے میں دستیاب وسائل کی حد تک اپنی ممکنہ مساعی بروئے کار لاتی ہے،اس میں بالعموم کوتاہی نہیں کرتی۔

کمیٹی کی بہتر کارکردگی کے لئے مزید اقدامات کی ضرورت

اس تاخیر کے خاتمے یا غلط فیصلے کے ازالے کے لئے مزید چند باتوں کا اہتمام ضروری ہے تا کہ کمیٹی کی راہ میں جو مشکلات ہیں،وہ دور ہوں اور اس کی کارکردگی کو مزید بہتر بنایا جاسکے اور یہ دو اقدامات ہیں جو حسب ذیل ہیں:

★ ایک یہ کہ اگر مصدقہ اطلاعات ایسی ملیں جن سے کمیٹی کا فیصلہ غلط ثابت ہوتا ہو تو ایسا انتظام ہونا چاہئے

کہ کمیٹی کے ارکان دوبارہ جمع ہوں اور تحقیق اور تفتیش کے بعد اگر فی الواقع پہلا فیصلہ غلط ہو تو اسے تبدیل کرنے میں کوئی عار اور سبکی محسوس نہیں کرنی چاہئے نہ اسے انا اور وقار کا مسئلہ بنانا چاہیے۔ شنید ہے کہ سعودی عرب میں بھی بعض دفعہ فیصلہ تبدیل کر کے نیا اعلان کیا گیا ہے۔ اس نظیر پر یہاں بھی عمل کرنا چاہئے، یہ ایک شرعی مسئلہ ہے جس میں شریعت ہی کی رو سے فیصلہ تبدیل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

★ دوسری بات یہ ہے کہ ملک میں عیسوی تقویم کے بجائے قمری تقویم کو اختیار کیا جائے تا کہ لوگ چاند دیکھنے کی کوشش کیا کریں، ہم نے چونکہ قمری تقویم سے تعلق بالکل منقطع کر دیا ہے، اس لئے لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام ہی نہیں کرتے، جو ایک بہت بڑی کوتاہی ہے۔ اس کوتاہی کا ازالہ بھی نہایت ضروری ہے، اور اس کا ایک طریقہ تو وہی ہے جو ہم نے عرض کیا، یعنی قمری تقویم کو اختیار کرنا، قمری تاریخیں ہی ملک میں رائج ہوں، اسی کے مطابق تنخواہیں ملیں اور اسی کے مطابق تعطیلات وغیرہ ہوں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر قمری تاریخ کو 29 شب کے لئے حکومت کی طرف سے چاند دیکھنے کی اپیل شایع ہو۔ حکومت اپنے مخصوص مقاصد وعزائم کے اظہار کے لئے بلا مبالغہ کروڑوں روپے اشتہارات کی مد میں خرچ کرتی ہے، اگر وہ چند لاکھ روپے اس کام پر بھی صرف کر دیا کرے تو اس کے بہترین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ چاند کی ہر 29 تاریخ کے قومی اخبارات میں اشتہار کے طور پر یہ اعلان شائع ہو کہ ''لوگ آج شام کو چاند دیکھنے کا اہتمام کریں اور چاند نظر آنے کی صورت میں حسب ذیل نمبروں پر فون کے ذریعے اطلاع دیں۔۔۔'' ہر علاقے کے اخبارات میں وہاں کی زونل کمیٹی کا فون نمبر دیا جائے، دیگر ضروری نمبر دیئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال ایک مسلمان مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہاں ذوق وشوق کے ساتھ چاند دیکھنے کا اہتمام ہو، اگر اس اہتمام میں کمی ہو تو اسے دور کیا جائے اور لوگوں میں چاند دیکھنے کی رغبت اور شوق پیدا کیا جائے۔

علامہ قرافی رحمہ اللہ نے رؤیت ہلال کے مسئلے پر بہت تفصیل سے لکھا ہے، اور یہ بحث ان کی مشہور تصنیف ''الفروق'' کے صفحہ نمبر 8 تا 15 میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ رؤیت ہلال کے دو پہلو ہیں ایک خبر کا اور دوسرا شہادت کا، اس اعتبار سے اس میں قضاء (فیصلہ) کا پہلو نمایاں ہے۔

خبر کی حد تک، تمام انتظامات کی ذمہ دار حکومت ہے۔ (ان میں جو کمی اور جو کوتاہی ہے، حکومت اس کے ازالے کا اہتمام کرے) کہ ہر ممکنہ طریقے سے، سائنسی آلات کی مدد وغیرہ لے کر یا عوام میں شعور اور رؤیت کا اہتمام پیدا کر کے کمیٹی کو چاند کے بارے میں تمام خبریں بروقت پہنچائی جائیں۔

جہاں تک شہادت کا معاملہ ہے اس کی جانچ پرکھ کا کام علماء کا ہے، وہی اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں کہ رؤیت ہلال کی جو شہادتیں میسر آئی ہیں، وہ کس حد تک قابل قبول یا قابل رد ہیں اور آیا ان کی بنیاد پر رؤیت کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟

حکومت کا کوئی انتظامی ادارہ شہادتوں کی جانچ پڑتال کا اہل نہیں کیونکہ اس میں حکومت کی سیاسی مصلحتیں اور مفادات درمیان میں آسکتے ہیں، جو اس سارے کام کو مشکوک بنادیں گے اور اسی وجہ سے عوام ان معاملات میں حکومت کے فیصلوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ جبکہ علماء کے سامنے اس قسم کے کوئی مفادات نہیں ہوتے، وہ تو صرف لوجہِ اللہ عوام کی دینی رہنمائی کا دینی فرضِ منصبی ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بنابریں رؤیت ہلال کمیٹی کے ختم کرنے کی تجویز غیر معقول اور ایک بنے بنائے نظم کو بگاڑنے کی مذموم سعی ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کمیٹی کو زیادہ مؤثر اور قابل اعتماد بنایا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں علماء کو صرف میرٹ کی بنیاد پر شامل کیا جائے ،یعنی ان علماء کو کمیٹی کا ممبر بنایا جائے جو مستند عالم اور عوام کے معتمد علیہ ہوں۔ محض سیاسی رشوت کے طور پر حکومت کی حلیف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں اور ان کے تجویز کردہ علماء ہی کو شامل نہ کیا جائے (جیسا کہ عام طور پر معمول ہے) بلکہ حکومت کی حمایت یا مخالفت سے قطع نظر اہل تر افراد کو نامزد کیا جائے۔

4۔ سعودی عرب بلا شبہ حرمین شریفین کے خادم ہونے اور دیگر بہت سی امتیازی خصوصیات کا حامل ہونے کی وجہ سے نہایت قابل احترام ہے، لیکن پاکستان اور سعودی عرب کے مطلع میں بہت زیادہ فرق ہے، اس لئے سعودی عرب کی رؤیت کو پاکستان کے لئے بھی قابل اعتبار گردانا شرعی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہوگا۔ شرعی نصوص کا تقاضا اور اکثر علماء کا فیصلہ یہی ہے کہ ایک علاقے کی رؤیت دوسرے علاقوں کے لئے کافی نہیں ہے الا یہ کہ مطلع کا زیادہ فرق نہ ہو جیسا کہ پہلے اس پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس اعتبار سے سعودی عرب کے فیصلے کو پاکستان کے لئے بھی لازم قرار دینا شرعی نصوص کے خلاف ہوگا۔

خلاصہ مباحث

مذکورہ مباحث وتفاصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

❂ عالم اسلام میں ایک ہی دن عید منانے اور رمضان وغیرہ کے آغاز کرنے کا جو تصور ہے، اس کی کوئی شرعی

بنیاد نہیں ہے، حتیٰ کہ سعودی عرب کی رؤیت کو بھی اس کے لئے بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

۞ عالم اسلام کے ممالک میں مطالع کا شدید اختلاف اور فرق ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی ایک ملک کی رؤیت کو عالم اسلام کے تمام ممالک کے لئے کافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۞ ہر علاقے کے لوگوں کے لئے ان کی اپنی رؤیت ضروری ہے، البتہ ایک ملک کی حد تک کسی ایک علاقے یا کسی ایک شہر کی رؤیت کو پورے ملک کے لئے قابل اعتبار گردانا جاسکتا ہے، کیونکہ ایک ملک کے شہروں کے مطالع میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا، تاہم مختلف صوبوں میں اگر الگ الگ عیدیں بھی اپنی اپنی رؤیت کی بنیاد پر ہوں تو شرعاً یہ بھی جائز ہے۔

۞ رصد و علم فلکیات کے علم سے چاند کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فائدہ اٹھانا اور اس پر اعتماد کرنا جائز ہے، تاہم فلکیات کی بنیاد پر سارے سال کے لئے کیلنڈر بنانا ناجائز ہے۔

۞ اہل خیبر کے معاملے کو علماء باہم مل کر حل کریں جیسا کہ ہم نے بھی اس سلسلے میں ایک تجویز پیش کی ہے، لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوسکے تو ان کا باقی صوبوں سے پہلے چاند دیکھ کر الگ عید منانا یا رمضان کا آغاز کرنا کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے کہ اس کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے ان کے معاملے کو ان کے علماء ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

۞ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کا طریقہ کار صحیح ہے اور اس کے فیصلے کے مطابق عید و رمضان کا آغاز کرنا صحیح ہے، اہل خیبر بھی اگر اس کے مطابق ہی عیدین اور رمضان کا اہتمام کریں تو بہتر ہے، تاہم اگر وہ اپنی رؤیت کے مطابق عمل کریں اور اپنے لوگوں کی شہادتوں پر اعتماد کریں جیسا کہ سالہا سال سے وہاں ایسا ہی ہوتا آرہا ہے تو شرعاً کوئی حرج والی بات نہیں۔

۞ پاک و ہند کے علمائے احناف کے نزدیک بھی مطالع کا فرق معتبر ہے، اس لئے پاکستان میں بعض علمائے احناف اور اہل خیبر کی اس رائے میں کوئی وزن نہیں ہے کہ پورے عالم اسلام میں ایک ہی دن عید منائی جائے۔

۞ جن ممالک میں موسم اکثر ابر آلود رہتا ہو، وہ ایسے ممالک کی رؤیت پر اعتماد کرسکتے ہیں جہاں رؤیت کے لئے شرعی تقاضوں کا اہتمام کیا جاتا ہو۔

رمضان المبارک کے مہینے میں ہمارے اسلاف کرام شب و روز کیسے گذارتے تھے؟

جمشید سلطان اعوان [1]

رمضان کریم کا مہینہ جب آتا ہے تو اپنے ساتھ اطاعت کا موسم بھی لاتا ہے جس میں درجات کی بلندی، حسنات ونیکیوں کا حصول آسمان وزمین کے مالک وخالق کے قرب کا حصول بھی آسان کردیتا ہے۔ اس مہینے میں مسلمانوں کے دل ایمان سے معمور ہوتے ہیں اور فسق و فجور سے تطہیر اور تزکیہ نفس حاصل ہوجاتا ہے یہ وہ مہینہ ہے جس میں نیکیوں کی قدرومنزلت میں بھی اضافہ کردیا جاتا ہے اور اعمال صالحہ کو قبول حاصل ہوتا ہے، پچھلے گناہوں اور لغزشوں کی بخشش کا موقع بھی فراہم کیا جاتا ہے، چنانچہ یہ وہ مہینہ ہے جس کی قدرو منزلت اللہ تعالی کے ہاں بہت ہی بلند واعلیٰ ہے۔ رمضان کا مہینہ قرآن کا مہینہ کہلاتا ہے اس مہینہ میں ایک رات ایسی بھی ہے جس کو اللہ تعالی نے ہزار سال سے بہتر قرار دیا ہے، اس مہینہ میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس مبارک مہینہ کے لئے پہلے سے تیاری فرمایا کرتے تھے۔

ہمارے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ ہوتا کہ جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا آپ عبادت کیلئے کمر کس لیتے، دنیا سے کنارہ کش ہوتے اور واحد ویکتا مالک کے حضور عبادت کیلئے کمر بستہ ہوجاتے یہی حال صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور ان کے بعد ہمارے اسلاف کا تھا۔

---

[1] فاضل مدینہ یونیورسٹی

امام معلیٰ ابن الفضل سلف صالحین کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ''وہ چھ ماہ قبل اللہ تعالی سے رمضان کریم کو پانے کی دعا کرتے اور بقیہ چھ ماہ تک اس مہینے میں کی گئی عبادت کی قبولیت کے لئے دعا کرتے''۔

امام یحییٰ بن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین یہ دعا کرتے:

"اللهم سلِّمني إلى رمضان وسلم لي رمضان، وتسلَّمه مني متقبلا".

''اے اللہ! ہمیں رمضان تک سلامت رکھ اور رمضان کو ہمارے لئے سلامتی والا بنااور اسے ہماری طرف سے قبول فرما''۔

ہمارے اسلاف اور اکابرین رحمہم اللہ رمضان کریم کا انتظار اتنے ذوق وشوق اور صدق دل کے ساتھ کرتے تاکہ یہ مہینہ ان کے لئے اعمال صالحہ میں اللہ تعالی کی طرف سبقت لے جانے کا مہینہ بن جائے۔

ذیل میں ہم انہی چند اعمال کا ذکر آثار سلف کی روشنی میں کریں گے جس سے واضح ہو کہ ہمارے اسلاف کا رمضان میں طرز عمل کیا تھا اور اب ہمارا کیا رہ گیا ہے! و باللہ التوفیق و السداد:

رمضان المبارک اور کرم وسخاوت کی بہار:

رمضان کریم میں آپ ﷺ کا اپنے رب کے ساتھ تعلق ایک عابد اور مطیع کا ہوتا، اپنے پڑوسیوں، غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ ایک سخی بادشاہ کا تعلق ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے اور خاص طور پر رمضان میں جب جبرائیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی ہوتے تھے اور جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ سے رمضان کی ہر رات میں ملتے اور قرآن کا دور کرتے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھلائی پہنچانے میں ٹھنڈی ہوا سے بھی زیادہ سخی تھے [1]

آپ ﷺ نے صدقات وخیرات، اور جود وسخا کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ امت کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

قِيلَ: يَا رَسُولَ الله أي الصَّوْمِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: " صَوْمُ شَعْبَانَ تَعْظِيمًا لِرَمَضَانَ "، قَالَ: فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: " صَدَقَةٌ فِي رَمَضَانَ "[2]

---

[1] بخاري :باب بدء الوحي

[2] سنن الترمذي :كتاب الزكاة، باب ماجاء في فضل الصدقة .و سنن الكبرى للبيهقي

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: کون سا روزہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شعبان کے مہینے کا روزہ جو رمضان کی تعظیم میں رکھا جائے'' پھر سوال ہوا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ صدقہ جو رمضان کے مہینہ میں دیا جائے''۔

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ '' بہترین سخی وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں رمضان کریم میں صدقہ خیرات کرے اور لوگوں کی ضروریات کو احسن انداز میں پورا کرتے ہوئے ان کو صیام وقیام کا موقع فراہم کرے''۔

حماد بن ابی سلیمان رمضان المبارک میں پانچ سو افراد کو افطار کراتے تھے اور عید کے بعد تمام افراد کو سو سو درہم عطا کرتے۔

رمضان المبارک کی راتیں اور قیام اللیل میں سر بسجود اللہ کے سپاہی

سلف صالحین کے نزدیک رمضان کا مہینہ اطاعت وعبادات کا موسم ہوتا، جس میں وہ اپنے رب کا قرب حاصل کرنے اور اس کے حضور میں اپنا تذکرہ عابد ومطیع کے طور پر کروانے کے لئے پرخلوص محنت و مشقت کرتے اور زندگی کے تمام شعبوں سے روگردانی اور کنارہ کشی کر لیتے تھے، رمضان المبارک کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنے گھروں اور مساجد کو قرآن کریم کی تلاوت سے منور کرتے اور خصوصی طور پر قیام اللیل کا اہتمام کرتے تھے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رمضان کریم میں مساجد کو روشن کراتے اور قرآن کریم کی تلاوت کے لئے صلاۃ التراویح کی سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہتمام کراتے، لوگوں کو قیام اللیل کے لئے مساجد میں جمع کرتے اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی۔ ابواسحٰق الھمدانی فرماتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رمضان کریم کی پہلی رات کو اپنے گھر سے باہر تشریف لائے تو مساجد میں قندیلیں روشن تھیں اور قرآن کی تلاوت جاری تھی آپ نے فرمایا ''اے عمر رضی اللہ عنہ! اللہ تعالی آپ کی قبر کو منور کرے جس طرح آپ نے اللہ تعالی کی مساجد کو قرآن سے منور کر دیا''[1]

ذرا غور کیجئے ان کا رمضان کریم میں کیا حال ہوا کرتا تھا؟؟؟ چونکہ ان لوگوں کو رمضان کریم کی راتوں کی

---

[1] فضائل القران ابن ابی الدنیا

فضلیت بخوبی معلوم تھی ، وہ لوگ اس کا حق بخوبی ادا کرتے تھے ،ان کا قیام اللیل تو سارا سال جاری رہتا اورصرف رمضان کریم تک محدود نہ تھا ان کو اللہ کے پیارے رسول ﷺ کے اس فرمان کا خوب اندازا تھا

" من قام رمضان إيمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه ".

ترجمہ:''جس شخص نے ایمان اور ثواب کی امید کے ساتھ رمضان میں قیام کیا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے'' اور جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ (یعنی شب قدر کی حقیقت کا ایمان واعتقاد رکھتے ہوئے) اور طلب ثواب کی خاطر کھڑا ہوا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو گزر چکے ہیں''۔ [1]

سائب ابن یزید کہتے ہیں ''امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم الداری رضی اللہ عنھما کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو قیام اللیل میں قرآن کریم سنائیں،ان میں سے ہر ایک دوسو آیات پڑھتا یہاں تک کہ ہمیں طویل قیام کی وجہ سے لکڑی پر ٹیک لگانی پڑتی اور ہم فجر سے کچھ دیر پہلے قیام سے فارغ ہوتے'' [2]

ابوعثمان النھدی کہتے ہیں کہ ''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تین قراء کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں قرآن کریم سنائیں ان میں سے ایک تیس آیات پڑھتا اور دوسرا پچیس آیات پڑھتا اور تیسرا بیس آیات کی قرآءت کرتا تھا [3]

امام مالک رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں عبداللہ ابن ابی بکر نے فرمایا ''میں نے اپنے والد سے سنا کہ ''ہم لوگ رمضان المبارک میں قیام اللیل سے جب فارغ ہوتے تو فجر کے خوف سے عجلت میں سحری کرتے'' [4]

خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قیام اللیل کا حال یہ تھا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھتے :

﴿أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ﴾ [الزمر :9]

---

[1] بخاري : كتاب الإيمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان.ومسلم كتاب صلوة المسافرين ،باب الترغيب في قيام رمضان وهوالتراويح

[2] بخاري :كتاب الصوم،باب من صام رمضان ايماناواحتسابا

[3] مصنف عبدالرزاق،باب قيام رمضان

[4] مؤطا:باب ما جاء في قيام رمضان

ترجمہ: بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں (عبادت میں) گزارتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہو۔

قال: "ذاك عُثمانُ بن عفَّان" ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ''یہ تو عثمان رضی اللہ عنہ کی صفات ہیں''۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مزید اس بارے میں فرمایا:

"وذلك لكثرة صلاةِ أميرِ المُؤمنين عُثمان بالليل وقراءتِه،".

''یہ فضیلت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو تہجد اور تلاوت قرآن کا کثرت سے اہتمام کرنے کی وجہ سے ملی [1]

امام نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے گھر میں ہی قیام اللیل کرتے اور جب لوگ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واپس لوٹتے تو آپ اپنے ساتھ پانی لیتے اور مسجد نبوی میں داخل ہو جاتے اور فجر کی نماز کے بعد ہی نکلتے''۔ [2]

امام نافع رحمہ اللہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ''میں لوگوں کو قیام اللیل میں امامت کراتا تو ایک رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور فاطر وغیرہ کی قرآءت کرتا تو یہ لوگوں پر ہرگز گراں نہیں تھی''[3]

امام ثابت البنانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''کوئی عبادت گزار اس وقت تک عابد نہیں کہلا سکتا جب تک اس میں دو صفات نہ پائی جائیں ایک راتوں کا قیام اور دوسرا دنوں کے روزے کیونکہ یہ دونوں اس کے خون اور جسم (گوشت) میں سے ہیں''

ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جو انہوں نے اپنے والد ماجد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی کہ

" أنّ جبريل عليه السلام كان يعارضه القرآن كل عام مرةً وأنّه عارضه في عام وفاته مرتين." [4]

''جبرئیل علیہ السلام ہر سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک مرتبہ قرآن مجید کا دور کرایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] تفسير ابن كثير: 7/ 88،تفسير ابن أبي حاتم2/ 109

[2] سنن الكبرى للبيهقي :باب من زعم ان صلوة التراويح

[3] مصنف ابن أبي شيبة 15/ 428

[4] سنن ابن ماجه:كتاب الصيام،باب ما جاء في الإعتكاف

کی وفات والے سال جبرئیل علیہ السلام نے دو مرتبہ دور کرایا''

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ رمضان کریم میں قرآن کریم کی رات میں کثرت سے تلاوت کی جائے کیونکہ رات میں تمام اعمال واشغال منقطع ہوجاتے ہیں اور طبیعت میں یکسوئی اور انسان کے قلب و ذہن تدبر وتفکر کے لئے تیار ہوجاتا ہے جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلاً﴾ [المزمل:6]

ترجمہ: رات کا اٹھنا یقینا (نفس کو) بہت زیر کرنے والا ہے اور قرآن پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں وقت ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''میں عبادات میں رات کی تاریکی میں پڑھی جانے والی نماز کے علاوہ کسی اور عبادت کو افضل نہیں پاتا''۔

امام ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سلف صالحین کے قیام اللیل کی سات صورتیں تھیں۔

1 کچھ ساری رات قیام کرتے اور عشاء کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز پڑھا کرتے۔

2 چند نصف رات قیام کرتے۔

3 کچھ ایک تہائی رات قیام کرتے اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

''أحب الصلاة إلى الله عز وجل صلاة داود كان ينام نصف الليل ويقوم ثلثه وينام سُدسه'' [1]

''اللہ تعالی کو داود علیہ السلام کی نماز بہت پسند تھی وہ آدھی رات سوتے اور تیسرا پہر قیام کرتے اور چھٹا پہر سوجاتے''

4 بعض دیگر سلف چھٹا پہر قیام اللیل کرتے تھے۔

5 چند قیام کرتے مگر جب ان پر نیند غالب آجائے تو سوجاتے اگر بیدار ہوتے تو پھر قیام کرتے۔

6 ان میں سے بعض چار رکعتیں اور بعض دو رکعتیں پڑھا کرتے۔

7 ان میں سے بعض مغرب اور عشاء کے درمیان قیام کرتے ہیں اور سحری کے وقت ہلکی نیند لیتے اس طرح

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الجمعة، باب من نام عند السحر

وہ دونوں اطراف کو جمع کر لیتے اسی طرح سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إن في الليل لساعة لا يوافقها عبد مسلم يسأل الله فيها خيراً إلا آتاه وذلك كل ليلة." [1]

سیدنا جابر سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رات میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس وقت جو مسلمان آدمی اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرما دیں گے اور یہ گھڑی ہر رات میں ہوتی ہے [2]

تلاوت قرآن کریم سے سلف صالحین کا تعلق

رمضان المبارک کا قرآن کریم کے ساتھ خاص تعلق ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان عالیشان ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾[البقرة:185]

ترجمہ: رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والے واضح دلائل موجود ہیں''۔

جبریل امین علیہ السلام بھی اس مہینہ میں پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رمضان میں قرآن کریم کا دور کراتے، اسی خصوصیت کے پیش نظر ہمارے اکابرین کا قرآن کریم کے ساتھ مکمل ربط ولگاؤ ہوتا جو رمضان کریم میں اپنے عروج پر نظر آتا۔

امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ رمضان المبارک میں تعلیم وتدریس، فتاویٰ اور علمی مجالس ترک کر دیتے اور قرآن کریم سے مکمل تعلق جوڑ لیتے اور کہتے ''هذا شهر القرآن'' ''یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے''۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ سات راتوں میں قرآن پاک کی تکمیل کرتے تھے اور جب رمضان آتا تو تین راتوں میں قرآن کی تکمیل کرتے تھے۔ابی عوانہ کہتے ہیں میں نے مشاہدہ کیا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ رمضان کریم میں صرف قرآن کریم کی تدریس کرتے تھے۔امام المحدثین محمد بن اسماعیل

---

[1] مسلم :كتاب المسافرين،باب أن في الليل ساعة مستجاب فيها الدعاء

[2] لطائف المعارف :ص315

البخاری رحمہ اللہ رمضان کریم میں ہر روز ایک ختم مکمل کرتے تھے اور تراویح میں ہر تین راتوں میں ایک قرآن کریم کی تکمیل کرتے۔

قاسم بن علی اپنے والد صاحبِ تاریخ دمشق ابن عساکر رحمہ اللہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ وہ باجماعت نماز پابندی سے ادا کرتے اور تلاوت قران کریم سے اپنی زبان وروح کو معطر رکھتے ان کا معمول تھا کہ ہر جمعہ المبارک کے دن قرآن کریم مکمل کرتے اور رمضان کریم میں ہر روز تکمیل کرتے اور مشرقی منار کے پاس اعتکاف فرماتے تھے۔

امام زہری رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب رمضان داخل ہوتا تو وہ تمام امور ترک کردیتے یہاں تک اپنی تعلیمی مجالس بھی ترک کرکے قرآن کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرلیتے ۔اس طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ رمضان میں تمام نفلی عبادات پر قرآن کریم کی تلاوت کو ترجیح دیتے تھے۔

امام زہری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ

" إذا دخل رمضان فإنما هو قراءة القرآن وإطعام الطعام " .

''جب رمضان کا مہینہ شروع ہوجائے توصرف قرآن کی تلاوت اور کھانا کھلانے کا اہتمام ہونا چاہئے''۔

اسود بن یزید رحمہ اللہ رمضان کے مہینہ میں ہر دو راتوں میں قرآن کریم مکمل کرتے اور مغرب اور عشاء کے درمیان آرام کرتے اور غیر رمضان میں چھ راتوں میں تکمیل قرآن کرتے۔[1]

امام الزاہد سعید بن جبیر رحمہ اللہ بھی رمضان کریم میں دو راتوں میں قرآن کریم کی تکمیل کرلیتے تھے۔

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تین دن سے کم مدت میں قرآن کریم کی تکمیل کی ممانعت جو وارد ہوئی ہے وہ مداومت اختیار کرنے والوں کے لئے ہے لیکن خاص اوقات جیسے رمضان کریم اور اماکن مفضلہ جیسے مکہ اور مدینہ میں غیر مقامی افراد کے لئے قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت مستحب عمل ہے یہی قول امام احمد بن حنبل اور امام اسحٰق رحمہم اللہ کا ہے اور اس پر ائمہ سلف کا عمل بھی ثابت ہے۔[2]

زبید الیامی رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب رمضان کریم کا مہینہ آتا تو آپ قرآن کریم پر اپنی

---

[1] سیر أعلام النبلاء للذهبي 4/ 51

[2] لطائف المعارف 183/1

توجہ مرکوز رکھتے اور اس پر اپنے اصحاب کو جمع کرتے تھے۔
ولید بن عبدالملک ہر تین راتوں میں قرآن کریم مکمل کر لیتے اور رمضان کریم میں ختم قرآن کی تعداد سترہ تھی۔

سلف کا اپنی زبان کی حفاظت کرنا:

رمضان کریم میں ہمارے اسلاف کا ایک معمول یہ تھا کہ وہ خاموش رہتے اور لغو باتوں سے پرہیز کرتے تھے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجةٌ في أن يدع طعامه وشرابه "

ترجمہ: جو شخص بری بات کہنا اور برا عمل نہ چھوڑے تو اللہ تعالی کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

امام مہلب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ روزہ میں لغو باتوں سے بھی اسی طرح رک جانا چاہئے جس طرح کھانے پینے سے انسان رک جاتا ہے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو اس نے اپنے رب کی رضا کو چھوڑ دیا اور اپنا عمل بھی ضائع کر دیا''۔[1]

امیر المومنین عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں بلکہ جھوٹ، لغو اور باطل چیزوں سے بھی رک جانے کا نام ہے''۔[2]

امام التابعین مجاھد ابن جبر المکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دو خصلتیں ایسی ہیں جن سے اگر کوئی محفوظ رہا تو اس کا روزہ بھی سالم رہا ''ایک غیبت اور دوسرا جھوٹ''۔[3]

سلف صالحین کے سحر کے اوقات کیسے تھے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سحری کی ترغیب دلاتے کیونکہ سحری روزہ دار کے لئے روزہ میں رہنا آسان کر دیتی ہے اور سحری کا وقت بابرکت ہوتا ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے

---

[1] أخرجه ابن أبي شيبة

[2] أخرجه ابن أبي شيبة

[3] صحيح البخاري :كتاب الصوم ،باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم

"تسحروا فإن في السحور بركة" [1]

ترجمہ: سحری کیا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔

چونکہ یہ رات کا آخری پہر ہوتا ہے اور اس میں نزول الٰہی ہوتا ہے اور یہ وقت استغفار کے لئے بھی موزوں ہے جیسا کہ فرمان باری جل وعلا ہے:

﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ [الذاريات :18]

ترجمہ: اور رات کی آخری گھڑیوں میں وہ بخشش مانگتے تھے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ﴾ [آل عمران : 17]

ترجمہ: اور رات کے آخری حصہ میں استغفار کرنے والے ہیں۔

ہمارے اکابرین کا مساجد میں وقت گذارنا

رسول اللہ ﷺ جب بھی نماز فجر سے فارغ ہوتے تو اس وقت تک اپنے مصلے پر بیٹھے رہتے جب تک سورج طلوع نہ ہو جاتا۔ [2] اور اس کا اجر وثواب بھی عظیم ہے سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

" من صلى الفجر في جماعة ثم قعد يذكر الله حتى تطلع الشمس ثم صلى ركعتين كانت له كأجر حجة وعمرة تامة تامة تامة " [3]

ترجمہ: جو شخص فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھا اللہ تعالی کا ذکر کرتا رہے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے اس کے لئے مکمل حج اور کامل عمرہ کا ثواب ہے''۔ یہ اجر وثواب غیر رمضان میں ہے تو رمضان المبارک کے دنوں میں اس کا اجر وثواب کتنا ہوگا؟

امام اہل السنہ والجماعۃ احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا تو مسجد میں اپنا اکثر وقت گذارتے اور کثرت سے تسبیح وتحمید اور اپنے رب سے استغفار کرتے تھے اور جب

---

[1] صحيح البخاري:كتاب الصوم،باب بركة السحور من غير ايجاب النبي ﷺ

[2] صحيح مسلم :كتاب المساجد و مواضع الصلوة،باب فضل الجلوس في مصلاه بعد الصبح

[3] جامع الترمذي: كتاب الجمعة،أبواب السفر[صححه الألباني]

انہیں کوئی حاجت ہوتی تو وہ مسجد سے باہر نکلتے اور قضاء حاجت کے بعد واپس مسجد میں آجاتے اور گھر بھی کسی ضروری کام کے لئے جاتے ورنہ مسجد میں ہی قیام پذیر رہتے یہ معمول ان کا پورے مہینہ رہتا۔ اور لوگوں کو بھی تلقین کرتے کہ ''یہ مہینہ گناہوں کے کفارہ کے لئے ہے اس لئے اس مہینہ میں ہم نہیں چاہتے کہ بقیہ مہینوں کی طرح گناہوں، خطاؤں اور برائیوں کے ساتھ گزار دیں''۔

ہمارے اسلاف اپنے روزوں کی حفاظت کرتے اور ہر ایسے عمل سے دور رہتے جس سے ان کے اجر و ثواب میں کمی واقع ہو یا وہ ناقص ہوجائے ،ان میں سے کسی نے کہا ''ہم اپنا وقت مسجد میں اسی لئے گذارتے ہیں کہ ہمارے صیام وقیام محفوظ رہ سکیں''۔

سلف صالحین اور رمضان المبارک میں کھانا کھلانے کا اہتمام

رمضان کریم میں اطعام الطعام کو خاص فضیلت و اہمیت حاصل ہے خود جناب رسول اللہ ﷺ افطار کرانے کی ترغیب دیتے اور اس بارے میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

" من أ فطر صائما كان له مثل أجره دون أن ينقص من أجر الصائم شيئا "[1]

ترجمہ: ''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا روزہ دار کو مگر روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی''۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف رحمہم اللہ رمضان کریم میں روزہ داروں کو افطار کراتے اور صدقہ و خیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور عظیم اجر وثواب کے حق دار ٹھرتے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ ہمیشہ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ افطار کرتے تھے اور اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ان کے گھر والوں نے ان (مساکین) کو بغیر کچھ دیئے واپس کردیا ہے تو وہ اسرات کو کھانا ہی نہیں کھاتے تھے۔ اور اگر افطار کے وقت کوئی سائل آجاتا تو آپ اپنا کھانا اسے جا کر دیتے اور خود ساری رات فاقہ میں گزار دیتے۔

عبداللہ بن مبارک اور حسن رحمہا اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ لوگوں کو کھانا کھلاتے اور ان کی خدمت کرتے اور انہیں پنکھے سے ہوا دیتے جبکہ وہ خود بھی روزہ دار ہوتے۔

---

[1] جامع الترمذي: كتاب الصوم،باب ما جاء في فضل من فطر صائما

ابوالسوار العدوی کہتے ہیں کہ ’’بنی عدی میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس مسجد میں نماز پڑھتے تھے ان میں سے کوئی بھی فرداً افطار نہیں کرتا اگر ان کے گھر کوئی آجاتا تو افطار کرلیتے ورنہ اپنا کھانا لے کر مسجد آجاتے اور لوگوں کے ساتھ افطار کرتے تھے‘‘۔

آخری عشرہ اور سلف صالحین کا طرز وتعامل

جب آخری عشرہ داخل ہوتا تو رسول اللہ ﷺ مزید اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہوجاتے اور اسمیں اتنی زیادہ عبادت کرتے جو کہ بقیہ رمضان کے دنوں میں نہیں ہوتی تھی حدیث میں آتا ہے کہ ’’جب آخری دس دن شروع ہوتے تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیتے اور اپنی راتوں کو زندہ کردیتے اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور خود بھی جاگتے‘‘[1]

صحیحین میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے آپ ﷺ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات نے بھی اعتکاف کیا‘‘[2]

اسی عشرہ میں ایک رات لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے اس میں جو شخص بھی ایمان اور ثواب کی امید سے قیام کرے اس کے گزشتہ تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔[3] اور اس رات میں اسلاف رحمہم اللہ قیام اللیل کے ساتھ خوب اذکار ودعا بھی کرتے تھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں ’’میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو حاصل کرلوں تو میں کیا دعا کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم یوں کہو:

’’اللهُمَّ إنك عفُوٌّ تحب العفو فا عفُ عني‘‘ [4]

ترجمہ: اے اللہ بلاشبہ تو معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے پس تو مجھے بھی معاف کردے‘‘

سلف صالحین رحمہم اللہ کے رمضان المبارک کے احوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف تمام اعمال جو روزہ کے اجروثواب میں کمی کے درپے ہوں چاہے وہ مفطرات حسی ہوں یا معنوی ان سے دور رہتے، اور

---

[1] صحيح البخاري:كتاب صلاة التراويح،باب العمل في عشر الأواخر

[2] صحيح البخاري:كتاب الإعتكاف،باب الإعتكاف في عشر الأواخر

[3] صحيح البخاري:كتاب الصوم،باب من صام رمضان ....

[4] جامع الترمذي :كتاب الدعوات،باب ما جاء في عقد التسبيح

تمام اعمال جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں اور اسے راضی کرنے میں معاون ہوں انہیں احسن انداز میں بجالاتے اپنی نیند کو بھی اسی طرح باعث اجر سمجھتے جیسے اپنے قیام کو باعث نجات سمجھتے تھے، گناہوں اور برائیوں، نافرمانیوں کے قریب بھی نہ جاتے اور نیکیوں اور اعمال صالحہ میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے، اپنے روزے تمام قسم کے مفطرات سے اور قیام کو ہر قسم کے فساد سے محفوظ رکھتے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرتے، اپنے نفس کو اور غیروں کو وصیت کرتے کہ ان کے روزہ کے ایام اور دیگر ایام مساوی نہ ہوں۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہما کا قول ہے ''اگر روزہ رکھو تو اپنے کانوں، آنکھوں اور زبان کو جھوٹ اور برائیوں سے روزہ رکھو اور اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ، اپنے غلاموں پر ظلم نہ کرو اور دیکھو تمہارا روزے والا دن اور عام دن ایک جیسے نہ ہوں اور اپنے اوپر سکینت اور وقار کو قائم رکھو''۔[1]

پس ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے اسلاف کی زندگیوں سے سبق حاصل کریں تا کہ ہمارا ایمان بڑھ جائے اور اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق بھی مضبوط ہو جائے، ہماری ہمتیں بھی بلند ہو جائیں اور عزائم پختہ ہو جائیں اور ہم ان کے مقتدی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہی سوال اور دعا ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کی پیروی نصیب فرمائے اور صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے منہج پر گامزن فرمائے اور ہمیں اعمال واقوال میں اخلاص عطا فرمائے، ہمیں ایمان واحتساب کے ساتھ صیام وقیام کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

---

[1] ابن أبي شيبة: كتاب الصيام، باب ما يؤمر به الصائم من قلة الكلام وتوقي الكذب

تدبر قرآن کریم کا مرکزی محور
نکتہ توحید کی وضاحت ہے

ابو عمار

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے؟

کیا سب اچھا ہے؟ ایک نظر اس طرف بھی !

مسلمانوں کی داخلی وخارجی صورتِ حال کا جائزہ

موضوع کی اہمیت سمجھنے کیلئے پہلے حالاتِ حاضرہ پر نظر ڈالیں اور مشاہدہ کریں کہ بھلائی کے کاموں کے حوالے سے درجنوں تحریکوں کے باوجود دینداری کم ہورہی ہے اور ملک ومعاشرہ کس انداز سے دن بدن بگڑتا جارہا ہے۔ امتِ مسلمہ ایک مذہبی اکائی کی حیثیت سے نہ صرف خارجی طور پر اس وقت انتہائی ذلت کی کیفیت سے گذررہی ہے بلکہ داخلی طور پر بھی تمام مسلم معاشرے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ بہتر ہوگا کہ پہلے صورتحال کا صحیح اندازہ کرلیا جائے۔ آیئے پہلے خرابی کے اشاروں (Indicators) اور ان کے نتیجہ

میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر نظر ڈالیں:

>> سودی لین دین ، بے پردگی و بے حیائی، زنا وعصمت دری، لاٹری اسکیمیں اور جوا میں.......اضافہ

>> غیر شادی شدہ لوگوں کی تعداد، اخلاقی بے راہ روی اور متعلقہ بیماریوں میں.......اضافہ

>> اضافہ کمسن بچوں کی قبل از وقت اور نا مناسب بے باکی میں.......................اضافہ

>> گھریلو جھگڑے، شرحِ طلاق، خاندانی تنازعات اور قطع رحمی میں....................اضافہ

>> بوڑھے والدین، بزرگوں کی بے قدری اور نظر اندازی میں..........................اضافہ

>> میوزک گروپس، کھیلوں میں بڑھتی ہوئی دلچسپی اور مقابلوں کی تعداد میں...................اضافہ

>> رشوت خوری، چوری، ڈاکے اور قتل آلودگی اور غیر صحت مندانہ ماحول میں...............اضافہ

>> مزاروں، آستانوں، پیروں اور عاملوں کی تعداد میں...............................اضافہ

>> عیش وعشرت کے سامان کی فراوانی اور اس کیلئے بھاگ دوڑ میں.........................اضافہ

>> شرکیہ معاملات، جادو ٹونا اور قبر پرستی کا رجحان میں..............................اضافہ

>> لاقانونیت اور بے انصافی، درآمدی اور صنعتی محتاجگی انٹرنیٹ کے منفی استعمال میں...........اضافہ

>> منشیات کا استعمال بشمول گٹکا، مہنگائی، لوگوں میں عدم برداشت کے رویہ (ہائی بلڈ پریشر) میں.....اضافہ

>> ہم جنس پرستی، مخنثوں (ہیجڑوں) کی تعداد اور قحبہ گیری وعدہ خلافی، دھوکہ دہی اور ملاوٹ میں......اضافہ

>> مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور فرقہ بندیاں ذہنی بے سکونی اور نفسیاتی امراض میں.......اضافہ

یہ تنزلی کا گراف واضح کرنے کیلئے ایک مختصر سا چارٹ تھا جبکہ حقیقت میں ہم اس سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں کیا بڑھتی ہوئی یہ خرابیاں ثابت نہیں کرتیں کہ خیر کی دعویدار تحریکیں کافی نہیں یا ان میں لازماً کوئی کمی اورخرابی ہے؟ یا پھر قوم کے مصلحین کی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ غور کریں کہ مسلمان آج کل کس بے وقعتی کی صورتِ حال سے گذر رہے ہیں اور کیوں یہود ونصاریٰ اور دیگر کفارِ عالم کی زبان اور ہاتھ سے غیر محفوظ ہیں۔ اپنی خامی اور خرابی پہچاننے کیلئے یہ سوچ ذہن سے نکالنی پڑے گی کہ ہم مطلوبہ یا پسندیدہ مسلمان ہیں۔ کیونکہ ہم شافعی، مالکی، حنبلی، دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی کہلانے میں نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ فخر محسوس کرتے ہیں اور نبی ﷺ سے براہِ راست نسبت یعنی محمدی کہلانے سے کتراتے ہیں۔ یہی وجہ کہ جب کسی جگہ کوئی مسلمان تکلیف میں ہوتا ہے تو پہلے دوسرے مسلمان یہ دیکھتے ہیں وہ ہمارا ہم مسلک ہے یا نہیں؟

پھر اگر مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ صرف تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں۔آج کے مسلمان عملاً مسلمان ہونے کے علاوہ سب کچھ ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ اصحابِ رسول ﷺ صرف اتباعِ وحی اور اسوۂ رسول ﷺ پر عمل کرکے کامیاب ہوئے جبکہ آج ہم ناکام ہیں۔اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اتباعِ وحی اور اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی کے مرحلے تک آتے ہی نہیں ہیں۔ہم کو چاہیئے کہ ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود سے سوال کریں کہ ہمارے ہر مذہبی عمل کا حوالہ اور بنیاد کیا ہے؟ صاف بات ہے کہ ہماری ساری کوششیں اپنے مذہبی راہنماؤں کی پیروی، آباءواجداد کی نقالی اور غیر مستند کتب سے رہنمائی تک محدود رہتی ہیں اور زندگی بھر وہی کچھ کرتے ہیں جو آباء واجداد اور فرقے کے نظام کے مطابق ہوتا ہے۔اب تو اکثر لوگوں کی دینی علمیت بے نام بزرگوں کے اقوال اور حکایتوں تک محدود ہوتی جارہی ہے ان بزرگوں سے منسوب مافوق الفطرت باتیں بڑے شوق سے سنی اور سنائی جاتی ہیں اور اس کے برعکس قرآن وحدیث کا لفظ سنتے ہی چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے اور منہ کا مزہ کڑوا ہوجاتا ہے۔

اسی طرح عقیدہ توحید کی سمجھ اور اسوۂ رسول پر عملدرآمد کا دعویٰ کرنے والوں کا المیہ یہ ہے کہ عملی معاملات میں غیر اسلامی طور طریقے اپنانے میں وہ اپنے ہم عصروں سے کسی طور کم نہیں مثلاً فضول خرچی، جھوٹ، کاروباری بددیانتی، رشوت، بے پردگی وغیرہ میں ہم پیالہ وہم نوالہ نظر آتے ہیں۔دوسروں پر شرکیہ طور طریقے کے الزامات لگانے والوں کو شرک کی مندرجہ ذیل صورت کے حوالے سے یہ فرمانِ الٰہی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○﴾ (الجاثیہ45:آیت23)

''کیا آپ نے اسے بھی دیکھا؟ جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور سمجھ بوجھ کے باوجود اللہ نے اسے گمراہ کردیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا ہے، اب ایسے شخص کو اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا اب بھی تم نصیحت نہیں پکڑتے''۔

اس کے علاوہ صرف دنیاوی زندگی کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی فکر میں غیر شرعی اور غیر متوازن

مصروفیات میں مشغولیت، اسلامی نمونہ (Model) کی تعلیمات سے دوری، خصوصاً شرک کے ارتکاب کی وجہ سے ہم بین الاقوامی سطح پر مرعوب ہوتے جارہے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (آلِ عمران :151)

''ہم عنقریب کافروں (حق کا انکار کرنے والوں) کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے، اس وجہ سے کہ یہ اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کرتے ہیں جس کی کوئی دلیل اللہ نے نہیں نازل کی۔

خود فیصلہ کریں کہ آج کے دور میں کون سا گروہ کس گروہ سے مرعوب ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقی خرابی بڑھتی جارہی ہے، قوم بے پردگی کی انتہا سے بے لباسی کی طرف بڑھ رہی ہے، نمازی اور باشرع افراد بھی نئی نئی اصطلاحوں کے تحت سودی لین دین میں خوب ملوث ہیں۔ ایک سائل یہ پوچھنے میں بھی حق بجانب ہے کہ ہزاروں خانقاہوں، آستانوں، مزاروں اور مدارس و مساجد میں لاکھوں زندہ یا فوت شدہ مذہبی رہنماؤں کی کثرت کے باوجود گمراہی کیوں بڑھ رہی ہے؟

اس صورتحال سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ ان تحریکوں میں لازمی کوئی بنیادی کمی یا خرابی ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی تحریکوں کی ناکامی کی اصل وجہ

اصل مسئلے سے صرفِ نظر

موجودہ صورتحال سے نمٹنے کیلئے بہت سے حل بھی تجویز کئے جاتے ہیں مثلاً کوئی جہاد کے نام پر حربی مزاحمت کی بات کرتا ہے، کوئی خلافت کے نفاذ اور کوئی تبلیغِ عبادات کو مسئلہ کا حل تصور کرتا ہے۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ سالوں سے جاری ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آتے بلکہ مسئلہ دن بدن بگڑتا جارہا ہے

مسلمانوں کی اراضی تسلسل سے کفار کے قبضے میں جارہی ہیں، وسائل پر کنٹرول بڑھتا جارہا ہے، اور یہ حقیقت کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کی اکثر کامیابی دوسرے مسلمانوں ہی کے تعاون سے ممکن ہوئیں، سیاسی اور معاشی محرکات اور وطنی حمیت کے زیرِ اثر ہونے والی ان رسّہ کشیوں کو جہادِ اسلامی کا نام دینا قابلِ غور معاملہ ہے۔ اسی طرح تبلیغِ عبادات کے ضمن میں مسجدوں میں لوگوں کی تعداد دکھا کر دینی رجحان میں اضافہ کی بات کی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آبادی کی مجموعی شرحِ اضافہ کے لحاظ سے دین کی طرف راغب ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کیونکہ مساجد اور ان کی گنجائش کے مقابلے میں ہسپتالوں، اسکولوں اور

کھانے پینے کے مراکز کی تعداد بے حساب ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ ہماری اصلاحی کوششوں کی وجہ سے ہی کچھ مشہور و معروف لوگ دین کی طرف راغب ہو رہے ہیں اور کچھ نہ کچھ دینی ماحول باقی ہے وگرنہ حالات زیادہ خراب ہوتے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی برائیوں سے آنکھیں پھیر کر اور نہی عن المنکر جیسے اہم فریضہ کو ترک کرتے ہوئے ایسی بات کہنا اور اس حد تک کی کامیابی پر مطمئن ہونا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی مرض میں مبتلا مریض کو ڈاکٹر اس کی بیماری کی جڑ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف درد کو وقتی طور پر دور کرنے والی دوا (Pain killer) دے اور مریض کے شکایت کرنے پر یہ احسان جتلائے کہ اگر یہ دوا نہ دی جاتی تو تم زیادہ تکلیف میں ہوتے یعنی اصل مرض اور اس کے علاج کا ذکر نہیں کرتے اور سطحی اقدامات پر مطمئن ہوتے ہیں اور ویسے بھی یہ ایک عمومی رویہ ہے کہ لوگ اپنی دینداری اور برتری کا اندازہ اسلام کے دیئے ہوئے معیار کے بجائے اپنے سے برے لوگوں سے تقابل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فلاں تو بالکل بے نمازی ہے ہم کم از کم نماز تو پڑھتے ہیں یا یہ کہ فلاں تو بالکل بے پردہ ہے ہم کم از کم چادر تو اوڑھتے ہیں!!

رہا یہ سوال کہ اسلام مغربی ممالک میں پھیل رہا ہے تو اس بات پر ہم پیدائشی مسلمانوں کے مطمئن اور خوش ہونے کا کیا جواز ہے؟ وہ ہمارے کردار کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوتے بلکہ وہ اقوام تو اپنے نظام سے بے زار اور اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر خود رجوع کر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تبدیلی قوم کے اصول کے تحت مسلمان ہو رہی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝ (سورۂ محمد 47 آیت 38)

(ترجمہ) اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو اللہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تمہارے جیسے نہیں ہونگے۔

اور یہ بھی سمجھ لیں کہ اسلام کبھی خطرے میں نہیں رہا اور نہ قیامت تک رہے گا! مسئلہ تو پچاس سے زائد اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے ہم پیدائشی مسلمانوں کی موجودہ کھیپ کا ہے کہ ہم مجموعی طور پر کرۂ ارض کے اکثر وسائل کے مالک ہونے کے باوجود دین کی تعلیمات و احکامات سے دور اور مترفین (خوش حال لوگوں) کے طور پر ڈھیل کے مرحلے سے گذر رہے ہیں اور اجتماعی صفایا (Mass Cleansing) بظاہر ہمارا مقدر نظر آتا ہے۔

اصل مسئلہ کیا ہے؟

① شرک کا ارتکاب ② نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ③ آپس میں فرقہ بندیاں ④ دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دینا ⑤ ناموسِ ربّ العالمین کے دفاع کے حوالے سے مجرمانہ غفلت

ہم نے ارتکابِ شرک اور آپس کا تفرقہ جیسے اہم اور اصل مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ رہنما حضرات اصلاحِ معاشرہ کے حوالے سے صرف ظاہری وجوہات اور درمیان سے صورتحال کو بہتر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہی عن المنکر جیسے اہم فریضے کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ مثلاً موجودہ تبلیغی تحریک تبلیغِ عبادات وفضائلِ اعمال کے ضمن میں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ مسلمان کو ایمان اور توحید کے تقاضے سمجھانا آخر کس کی ذمہ داری ہے؟

اسی طرح اکثر بزعم خود چند جہادی تحریکیں اعلائے کلمۃ الحق کے پہلو سے خالی اور محض خطۂ زمین کی آزادی اور دشمنوں سے بدلہ لینے کیلئے ہیں اسی طرح کچھ لوگ خلافتِ اسلامیہ کے نفاذ کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں مگر آپ خود غور کریں کہ نظامِ خلافت کے نفاذ کی موجودہ کوشش تفرقے کے جواز پر مطمئن، الگ الگ اماموں پر قائم لوگوں کو ایک خلیفہ کے جھنڈے تلے کس طرح جمع کر سکتی ہے؟ دوسرے الفاظ میں موجودہ صورتحال (Status quo) کے ساتھ خلافت کا نفاذ ایک ناممکن بات ہے کیونکہ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ نظریاتی طور پر متفرق لوگ اگر بظاہر ایک تحریک اور ایک رہنما کے تحت ایک پلیٹ فارم پر اکھٹے ہو بھی جائیں تو ایک وقت آتا ہے کہ بنیادی اختلاف حاوی ہو جاتا ہے اور اتحاد کی ہنڈیا بیچ چوراہے پر پھوٹ جاتی ہے۔

جب تک دل اسلامی اخوت کے تحت نہ جڑیں اور نظریاتی (تفرقی) اختلاف کا خاتمہ نہ ہو اس وقت تک کتنے بھی راستے اختیار کر لئے جائیں سب بے سود ہیں۔ اس ساری بحث کا مقصد محض اعتراض اور لوگوں کی کوششوں پر تنقید نہیں بلکہ بصد خلوص و احترام یہ نکتہ گوش گذار کرنا ہے کہ متفرق رہتے ہوئے اور تفرقے کو جائز قرار دیتے ہوئے اصلاحِ احوال کی ساری کوششیں بے فائدہ ہیں اور اصل کام یعنی اسباقِ توحید کی تبلیغ کو نظر انداز کرنا بہر حال ایک سنگین غلطی ہے کیونکہ توحید کو اپنانا اس کی تبلیغ وترویج محض پسند، ناپسند یا اختیاری (Optional) نہیں بلکہ لازمی اور ترجیحی کام ہے۔ باقی سارے کام اس کے بعد ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت مسلمان کس قسم کے شرک میں مبتلا ہیں؟ آیئے دیکھیں

مسلمانوں کی اکثریت نے اللہ تعالیٰ کو عملاً نظر انداز کردیا ہے۔ جب کوئی آفت اور مصیبت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں سے مدد مانگتے ہیں۔ پریشانی دور ہونے کے بعد خوشی کے وقت شکرگزاری (بذریعہ نذرو نیاز) غیر اللہ کی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں تو وہ بھی گانا گانے کے انداز میں۔ توبہ واستغفار کی بجائے قبروں اور مزاروں پر فریاد کرتے ہوئے روتے دھوتے ہیں، آقائے حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی غلامی میں مطمئن ہونے کے بجائے غلاموں کی غلامی میں خوش ہیں۔ چنانچہ جب کوئی اللہ تعالیٰ کے وقار کا لحاظ نہیں کرے گا تو اسے اپنے حصے کی ذلت تو برداشت کرنی پڑے گی!

جب مسلمان توحید کے حوالے سے اللہ تعالیٰ سے مخلص نہ ہوں گے تو متحد کیسے رہ سکتے ہیں؟ عقیدہ توحید کا نفاذ ہوگا تو آپس کا اتحاد بھی ممکن ہوگا کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کے بجائے انسان کو حاکمیت، اہمیت اور اختیار دینے کے مترادف ہے جو تفرقے کو پروان چڑھانے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تفرقے اور اَنانیت کے جراثیم شرک کے ناسور میں پروان چڑھتے ہیں یعنی تفرقہ مسلمانوں کے ارتکابِ شرک کا منطقی اور حتمی نتیجہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عمل اور اثر کے لحاظ سے ایک متفرق کیلئے تفرقہ کے شکنجے سے نکلنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ایک غیر مسلم کیلئے اپنا عقیدہ اور مذہب چھوڑ کر دینِ اسلام میں داخل ہونا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں اندرونی کشمکش اور بیرونی مخالفت کی نوعیت وشدت تقریباً برابر ہوتی ہے سوائے ان لوگوں کے جن کیلئے اللہ تعالیٰ آسان کردے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ○ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ (ھود 11 آیت 118-119)

(ترجمہ) اور لوگ ہمیشہ اختلاف میں پڑے رہیں گے مگر وہ (محفوظ ہوگا) جس پر اللہ رحم کرے۔

صورتحال کا کیا حل ہے؟

عقیدہ توحید کی سمجھ اور عملی مطالبوں پر عملدر آمد

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس صورتحال سے نکلنے کا کیا طریقہ ہے؟ اگر غور کریں تو ہم بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ صرف عقیدہ توحید کے عملی مطالبوں پر عملدر آمد ہی صورت حال پر قابو پانے میں مدد دے سکتا ہے۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا سب سے اہم اور بڑا موضوع اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کے ذکر اور وضاحت سے متعلق ہے اور عقیدۂ توحید کے عملی مطالبوں کی تفاصیل زیادہ تر قرآن مجید ہی میں بیان کی گئی ہیں۔ عقیدہ توحید کا سیدھا سادہ مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ کا غلام سمجھے، وہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کو واحد مختارِ کل سمجھتا ہو اور اس کا ہر عمل آقا کی مرضی کے مطابق ہو۔ چنانچہ توحید الٰہی کی سمجھ اور نفاذ اولین نکتہ ہے۔ ہر خیر کی بنیاد توحید سے ہے اور ہر شر کا محرک شرک اور اس کی اقسام ہیں۔ اس نکتہ کو اثرات ونتائج کے لحاظ سے پرکھیئے۔ پہلی بات تو یہ ہے رسول اکرم ﷺ نے بھی ابتدا میں صرف ایک نکاتی لائحہ عمل اختیار کیا وہ یہ کہ کفار کے دل و دماغ سے شرک کا ناسور نکالا اور اسباقِ توحید کی تعلیم دی یعنی ابتدا عبادات یا اذکار کی تبلیغ سے نہیں کی بلکہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور وقار کا احساس دلایا اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں غیر اللہ کی شراکت کی ہر لحاظ سے مذمت کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتہائی محدود عرصے میں تمام کا تمام معاشرہ یکسر بدل گیا۔ جو ایک دوسرے کے قتل کے گرویدہ تھے وہ ''بنیان مرصوص'' سیسہ پلائی دیوار بن گئے، جو شراب خوری کے دلدادہ تھے انہوں نے مٹکوں کے مٹکے مدینے کی گلیوں میں بہادئے۔ یہ سب توحید کی برکت سے ممکن ہوا۔

حل کا اطلاق کیسے ممکن ہے؟

عقیدۂ توحید کی سمجھ بذریعہ تدبر واتباعِ قرآن کریم

اب سوال یہ ہے کہ عقیدہ توحید کس طرح سمجھا اور سمجھایا جائے تو مختصر سا جواب ہے کہ ''تدبر قرآن کے ذریعے'' جو بقول شخصے ''بہت آسان مگر بہت مشکل۔'' آسان اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے آسان کردیا ہے اور مشکل اس لحاظ سے کہ نفس کُشی اور تفرقے کی مقدس گائے کو قربان کئے بغیر اس پر عملدرآمد ممکن نہیں۔ چنانچہ موجودہ صورتِ حال سے نکلنے کا واحد، عملی، آسان اور موثر ذریعہ تدبرِ قرآن ہے۔ قرآن کریم کے نزول کا اہم مقصد اس پر غور وفکر ہے تا کہ وحی کی اتباع کی جاسکے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (ص 38 آیت 29)

(ترجمہ) یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی

آیتوں پر غور وفکر کریں اور عقل منداس سے نصیحت حاصل کریں۔

نیز فرمایا:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ o (انعام 6 آیت 155)

(ترجمہ) اور یہ کتاب (قرآن) جو ہم نے نازل کی ہے بڑی بابرکت ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

نیز فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o

یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل کیا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔ (النحل 16 آیت 44)

کیا کلام اللہ کی اتباع لازمی ہے؟

اس بات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو بھی کئی مقامات پر تاکید کی گئی ہے کہ وہ بھی کلام اللہ کی اتباع کریں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ o (انعام 6 آیت 106)

(ترجمہ) آپ اس چیز کی اتباع کیجئے جو آپ کی طرف آپ کا رب نازل فرمائے اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے منہ پھیر لیجئے۔

اب یہ بات واضح ہوجانی چاہئے کہ نزولِ قرآن کا اہم مقصد اتباعِ قرآن ہے اور اتباع کیلئے تدبّرِ قرآن ضروری ہے۔ تلاوت ، ترجمہ اور تفسیر تو تدبرِ قرآن کے عملی اور مددگار مراحل (Practical Helpful Steps) ہیں۔ کچھ لوگ عربی زبان کی اہلیت کو تدبرِ قرآن کیلئے ابتدائی شرط قرار دیتے ہیں مگر اکثر عرب اقوام کا موجودہ حال اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل زبان ہونا الگ بات ہے اور قرآن کریم پر غور وفکر کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا الگ بات ہے۔ بالفاظِ دیگر زبان دانی کی اہمیت اپنی جگہ مگر شوق اور عزم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر عربی جاننے والے بھی تدبّرِ قرآن کے مرحلے سے دور ہیں۔ صرف عربی زبان جاننا کافی نہیں بلکہ شوق اور عزم بھی ہونا چاہئے۔

موجودہ زمانے میں قرآن کریم سے کس قسم کا تعلق ہے؟

غور کیجئے! کہ تدبرِ قرآن کے برعکس عملاً ہوتا کیا ہے؟ 30-40 سالہ پرانے حفاظِ قرآن سمیت ہم میں سے اکثر لوگ زندگی بھر صرف تلاوت یا سماعتِ قرآن کریم پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اندازِ قرأت، مخارج اور خوش الحانی کو نزولِ قرآن کے مقصد پر فوقیت دیدی گئی ہے اور سارا زور انہی نکات پر دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل حدیثِ رسول کافی اہمیت کی حامل ہے۔

سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک دن قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ الحمد للہ، اللہ کی کتاب ایک ہی ہے اور تم میں سرخ، سفید اور سیاہ قسم کے لوگ اسے پڑھنے والے ہیں، قرآن پڑھا کرو بعد میں ایسے لوگ اسے پڑھیں گے جو اس کے حروف کو تیر کی طرح سیدھا کرتے ہوئے پڑھیں گے (صرف مخارج پر زور دیں گے) اور اپنا اجر دنیا ہی میں طلب کریں گے آخرت کیلئے نہیں۔ (ابوداؤد)

ویسے بھی تلاوت پر ثواب کا پہلو یعنی ہر حرف پر دس نیکیاں تو رب کریم کی عطائے بیش بہا کا مظہر ہے مگر صرف ثواب کی خاطر قرآن پاک کا پڑھنا یا سننا اور پھر اسی سوچ کے تحت ہی ساری زندگی گذار دینا اس نعمت کی ناشکری اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ ہے اور ایسا ہی ہے جیسے کسی چیز سے ادھورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اسی طرح بعض افراد قرآن مجید کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے کو اپنا حتمی مقصد بناتے ہیں یہ مقصد بھی نامکمل ہے یعنی صرف ترجمہ پر مطمئن ہوجانا بھی غلط ہے۔ بلکہ اس میں غور وفکر (تدبر) کرنا ہی اس کے نزول کا اہم مقصد ہے۔

تدبرِ قرآن سے کیا مراد ہے؟

عام فہم الفاظ میں تدبرِ قرآن کے معنی ومقصد یہ ہیں کہ انسان دورانِ تلاوت یہ غور کرے کہ کلام اللہ کی آیات کس طرح عملی زندگی میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں یعنی ہر آیت کی تلاوت اور ترجمے کے بعد توقف کریں، غور کریں اس کے احکامات پر عمل پیرا ہوں اور پھر آگے بڑھیں کیونکہ جلدی کرنے سے تدبر کا مقصد ومرحلہ چھوٹ جاتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے مظاہر، پچھلی اقوام کے انجام اور قرآن کریم میں انتہائی گہری نظر سے غور وفکر کرنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط پر آنے والے عذاب کا تذکرہ

کر کے فرمایا:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ o (الحجر 15 آیت 75)

''بلاشبہ اس میں گہری نظر سے غور و فکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔''

نیز رسول اللہ ﷺ نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر 164 اور ال عمران کی آخری آیات کے حوالے سے واضح کرتے ہوئے فرمایا:

اس شخص پر افسوس ہے جو ان آیات کو پڑھ کر گذر جاتا ہے لیکن غور نہیں کرتا۔[1]

اس اصول کو قرآنِ کریم میں ایک اور انداز سے اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَۃٍ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ مَثۡنٰی وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا (سبا 34 آیت 46)

کہہ دیجئے کہ میں تمہیں صرف ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے واسطے دو دو ساتھ مل کر یا تنہا تنہا کھڑے ہو کر اور پھر غور و فکر کرو۔

تدبرِ قرآن کس قدر اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کفارِ مکہ اہل زبان ہونے کی وجہ سے سماعتِ قرآن کی ہی مزاحمت کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا لِہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَ الۡغَوۡا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ o

(ترجمہ) کافر (اپنے ساتھیوں سے) کہتے ہیں کہ اس قرآن (کی تلاوت) نہ سنو بلکہ (دورانِ تلاوت) شور و غل کرو شاید کہ تم (مسلمانوں پر) غالب آ جاؤ۔ (حم السجدہ 41 آیت 26)

کیونکہ اہل مکہ اہل زبان تھے اس لئے ان کیلئے تدبرِ قرآن سماعتِ قرآن کے ذریعہ ممکن تھا اور آج کے علمائے سوء قرآنِ کریم کی تلاوت و سماعت سے تو نہیں روکتے مگر ترجمہ و تفسیر کی مزاحمت کرتے ہیں تو بتائیے کہ تدبر و اتباعِ قرآن کیسے ممکن ہے؟۔ ان دونوں گروہوں کے مقاصد ملتے جلتے ہیں اور زندگی یوں ہی گذر جاتی ہے۔

تدبرِ قرآن سے دوری کی وجوہات

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مسلمان قرآنِ کریم سے اس قدر دور کیوں ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ شیطان نہیں

---

[1] صحیح ابن حبان، الترغیب والترہیب

چاہتا کہ مسلمان اس کتاب سے براہِ راست فائدہ حاصل کرنے کے قابل بنے اور نہ ہی کفارِ عالم اور نہ ہی علمائے سوء ایسا چاہتے ہیں کیونکہ اس طرح طاغوت کے ائمہ اور ان کے نمائندوں کی دکانیں بند ہوجائیں گی اور مسلمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے براہِ راست قائم ہوجائیگا۔ کیونکہ جب قرآنِ کریم پر تدبر کریں گے تو عام آدمی کو معلوم ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو کس بات کی تبلیغ کیلئے مبعوث فرمایا؟ یعنی تبلیغِ عبادات پہلے ہے یا تبلیغِ عقیدۂ توحید؟ مزید یہ کہ جہاد بالسیف کب، کس لئے، کس انداز سے اور کس کے خلاف؟ اور اولین جہاد کیا ہے؟ یعنی فضائلِ جہاد کے ساتھ مسائلِ جہاد سے بھی آگاہی ہوگی۔ اسی طرح فرقوں میں بٹ کر رہنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے یا متحد ہوکر رہنا؟ اسی طرح آباواجداد کی اندھی پیروی کی سوچ صحیح ہے یا صرف رسول اکرم ﷺ کی اتباع ضروری ہے؟ اس طرح بزرگوں، پیروں اور مشائخ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو شامل کرنا صحیح ہے یا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اس کی صفات کا حقدار سمجھنا لازمی ہے؟ اور یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ کو براہِ راست سوال کرنا پسند ہے یا کوئی واسطہ اختیار کرنا ضروری ہے؟ یعنی دل کا حال جاننے والے، اور پکارنے والے کی دعا کو قبول کرنے والے مہربان رب تک پہنچنے کیلئے واسطے اور وسیلے کے لمبے راستے کا کیا منطقی جواز ہے؟ اگر سارے انسان یقین کی حد تک صرف اس نکتے کو سمجھ لیں کہ اکیلا اللہ براہِ راست، ہمہ وقت، ہر انسان کی ہر قسم کی مدد کیلئے موجود اور کافی ہے تو کوئی انسان اپنی حاجت روائی کیلئے کسی غیر اللہ پر ایک لمحہ اور ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرے اور اس کے نتیجے میں تمام زندہ اور فوت شدہ نام نہاد مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کے کارخانے از خود بند ہوجائیں گے اور مندی کی وجہ سے یہ سارا کاروبار ٹھپ ہوجائے گا کیونکہ کون احمق ہوگا جو اکیلے اللہ سے سب کچھ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی در در کی ٹھوکریں کھائے گا؟

مختصر یہ کہ قرآن کریم ہر معاملے بشمول جہاد، تبلیغِ دین، نظامِ خلافت کا اطلاق، نظامِ معاشرت و معیشت، غرض تمام شعبوں کیلئے رہنما اصول واضح کرتا ہے یوں کوئی بھی مسئلہ، مسئلہ نہیں رہتا اور انسانی شریعت سازی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی مسلمان کی نظریاتی و عملی رہنمائی بذریعہ کتاب اللہ اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے کردی گئی ہے۔ ان دو بنیادی ذرائع کا ذکر قرآنِ مجید میں ہی بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝

(ترجمہ) اور ہم نے آپ پر جو کتاب نازل کی ہے اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے اور ہدایت، رحمت اور مسلمانوں کیلئے خوشخبری ہے۔ (النحل 16 آیت 89)

نیز فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب 33 آیت 21)

(ترجمہ) تمہارے لئے رسول (ﷺ کی ذات) بہترین نمونہ ہے۔

تدبرِ قرآن کے ثمرات

اب تدبرِ قرآن کے ثمرات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ تدبرِ قرآن مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کس طرح تبدیلیاں لاتا ہے؟ پہلا فائدہ یہی ہے کہ تعلیماتِ قرآنی عقیدۂ توحید کی مکمل وضاحت کرتی ہیں اور انسان توحید اور شرک کے فرق کو سمجھنے لگتا ہے اور جب عقیدۂ توحید رگ و پے میں رچ بس جاتا ہے تو پھر انسان اللہ تعالیٰ کو عملاً اپنا حقیقی مالک اور آقا سمجھتا ہے اور پھر اس کو ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی کافی نظر آتا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، صرف اس ہی سے سوال کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی عقیدۂ توحید کی برکت سے وہ محمد ﷺ سے اُس انداز میں محبت کرتا ہے جس انداز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی وہ آپ ﷺ سے رسمی محبت اور عقیدت کے بجائے عملاً ان کا پیروکار بن جاتا ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہے کیونکہ نبوت سے پہلے اہلِ مکہ آپ ﷺ سے محبت و احترام کرتے تھے اور صادق و امین سمجھتے تھے۔ لیکن توحید کے مطالبات سن کر آپ ﷺ کے دشمن بن گئے پھر جب اسباقِ توحید سمجھ گئے تو مسلمان ہو کر رسول اکرم ﷺ سے اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے دوبارہ محبت کرنے لگے۔ اس کا منطقی اور ذیلی فائدہ یہ بھی ہوا کہ توحید کی برکت سے ان کی آپس کی دشمنی بھی ختم ہوگئی۔ یہاں بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپس کا تفرقہ صرف موحد بننے (توحید پر عمل پیرا ہونے) کی صورت میں ختم ہوسکتا ہے چنانچہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت عقیدۂ توحید کی روشنی میں قائم ہوگی تو آج کے مسلمان بھی ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو مقدم رکھیں گے یعنی مسلمان کتاب اللہ اور اسوۂ رسول ﷺ کی تفصیلات کو کافی سمجھیں گےیعنی جب قرآن کریم پر تدبر ہوگا تو فکری انقلاب آئے گا اور یوں یہ صورتِ حال اسلامی معاشرے کے احیاء اور عروج کی بہترین مثال ہوگی۔

لائحہ عمل

✳ ہر کام سے پہلے منصوبہ سازی لازمی ہے اور یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ حالات میں تبدیلی کا کوئی مختصر راستہ (Short cut) نہیں ہے۔ جولوگ اس وقت مسلمانوں کے حالات سے مایوس ہیں اور تبدیلی کے خواہشمند ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح بگاڑ میں وقت لگا اسی طرح تعمیرِ نو (Reform) بھی وقت طلب معاملہ ہے چنانچہ ہمت نہ ہاریں۔حالات بدلنے کے انتظار میں نہ رہیں اور کم از کم اپنی اور اپنے

✳ گھر والوں کی فکر کریں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ

(ترجمہ) اے ایمان والو! تمہیں اپنی فکر کرنا لازم ہے (المائدہ 5 آیت 105)

✳ تدبرِ قرآن کا کام پورے ادب واحترام، توجہ، کھلے دل ودماغ اور مکمل غیر جانبداری کے ساتھ کریں اور کلام اللہ کے بیان کردہ نکات کو حرفِ آخر سمجھیں تاکہ ذہن میں موجود گزشتہ معلومات سے تقابل کی صورت میں ذہنی انتشار پیدا نہ ہو۔

✳ تدبرِ قرآن کے حصول کیلئے روزمرہ کی بنیاد پر باقاعدہ وقت نکالئے جیسا کہ دیگر ضروری کاموں کے لئے اہتمام کرتے ہیں۔ہم مسلمان اگر رسائل وجرائد یا کم از کم اخبارات پڑھنے میں لگنے والے وقت کا 50٪ بھی روزمرہ کی بنیاد پر تدبرِ قرآن پر لگادیں تو کافی بہتری آجائے گی۔لہٰذا اپنے آپ سے سنجیدہ ہوں، پہلے اپنے نفس کو اس نکتے پر قائل کریں کہ واقعی نزولِ قرآن کے مقاصد کو سمجھنا بھی ضروری ہے اور یہ سمجھ لیں کہ نفس کشی لازمی امر ہے اور گھر کے ماحول اور اپنی عادات بدلے بغیر یہ مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے اور وقت نکالنے کیلئے دنیاوی زندگی کی مصروفیات ومعاملات کو محدود (Limit) کرنا ہوگا یعنی ترجیحات کو بدلنا ہوگا کیونکہ دنیا کی محدود زندگی کے مقابلے میں آخرت کی ہمیشگی والی زندگی کی فکر زیادہ ضروری ہے۔

✳ ذاتی پاکی وصفائی کو یقینی بناتے ہوئے گھر کے پاک وصاف، روشن اور ہوادار حصہ کو تلاوت اور تدبر

قرآن کیلئے مخصوص کیجئے۔

✵ ذہنی یکسوئی کو منتشر کرنے والے اسباب مثلاً بھوک، نینداور دیگر مصروفیات و مجبوریوں کو دور کریں یعنی توجہ اور سکون کو یقینی بنائیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ھُوَ شَہِیۡدٌo

(ترجمہ) بلاشبہ اس (قرآن کریم) میں ہر صاحبِ دل کے لئے نصیحت ہے اور اس کے لئے بھی جو دل سے متوجہ ہو کر کان لگائے اور وہ حاضر (دماغ) بھی ہو۔(قٓ 50 آیت 37)

✵ اپنی نظر (Eye sight) کے مطابق باترجمہ تفسیر ابن کثیر کے ذاتی نسخے کا انتظام کریں۔

آغازِ تلاوت سے پہلے

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

ضرور پڑھیں تاکہ دورانِ تلاوت شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کا سمجھنا آسان کردے اور دعائے قرآنی:

رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا اور رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ

بھی ضرور پڑھیں۔ دورانِ تلاوت ہر آیت کو ترجمے کے ساتھ بار بار پڑھیں تاکہ اس آیت کے معانی و اسباق واضح تر ہو جائیں۔

✵ تدبرِ قرآن کو ہمیشہ مدنظر رکھیں لہٰذا مقدارِ تلاوت پر زور نہ دیں جب تک بات سمجھ میں نہ آجائے آگے نہ بڑھیں۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو پہلی بار میں سمجھ میں نہ آنے والی بات پر مت گھبرائیں یہ منطقی بات ہے کہ آسان چیز جلد سمجھ میں آتی ہے اور مشکل چیز سمجھنے کیلئے وقت مانگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے

وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍo (القمر 54 آیت 17)

(ترجمہ) اور یقیناً ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

✵ مشکل کی صورت میں گھبرائیں نہیں بلکہ اپنی محنت جاری رکھیں کیونکہ قرآنِ کریم کا یہ اسلوب ہے کہ مشکل بات کو ایک سے زائد مقامات پر مختلف انداز میں بیان کر دیا جاتا ہے اور اس طرح مشکل نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر ایسے اہلِ علم سے وضاحت طلب کریں جو صرف

کتاب اللہ اور اسوۂ رسول ﷺ کو راہِ عمل بناتے ہیں اگر آپ کسی ایسے آدمی کے ہتھے چڑھ گئے جو قرآن وحدیث میں خامی تلاش کرتا ہے اور ان دونوں کو ناکافی قرار دیکر قیاس اور رائے دہی کے نام پر شریعت سازی کرتا ہے تو آپ کا معاملہ ایسا ہی ہوجائے گا جیسے کوئی آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔اس بات کو پرکھنے کا سب سے اچھا معیار یہ ہے کہ اگر آپ کسی صحیح عالمِ دین سے کوئی مسئلہ دریافت کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ صحیح عالم مسئلے کا حل آپ کو قرآنِ کریم، اسوۂ رسول (احادیث نبوی) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختیار کردہ طریقۂ عمل کی روشنی میں مکمل حوالوں کے ساتھ فراہم کرے گا۔اس کے برعکس نام کا عالم مسائل کا حل قرآن وحدیث جیسے بنیادی معیارات کو چھوڑ کر بلا دلیل وقیاس اور اپنے بزرگوں کی آراء کی روشنی میں فراہم کرے گا اور اس کے حوالہ جات صرف اپنے مکتبۂ فکر سے متعلق مصنفین کی کتب سے اخذ شدہ ہوں گے اور یہ اس کے کمزور اور جعلی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

✳ ہر تلاوت کے بعد ایک اضافی نکتے سے ضرور فائدہ اٹھائیں وہ یہ کہ تلاوت کے بعد اپنے اور اپنے پیاروں کیلئے دنیا اور آخرت کے ہر معاملے کیلئے دعا کریں۔

یاد رکھیں کہ تلاوت کا ثواب بعینہٖ (such As) منتقل (Transfer) نہیں ہوتا بلکہ بعد از تلاوت دعا کے ذریعے ربّ کریم کے سامنے مدعا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ زندہ یا فوت شدہ انسانوں کے معاملات آسان فرمائے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اس وقت مختلف گروہوں میں منقسم ہیں اور عملاً بُعد المشرقین (Poles Apart) ہیں چنانچہ آپس کی وحدت کیلئے اللہ تعالیٰ کی توحید کو سمجھنا لازمی ہے۔حالات میں تبدیلی صرف اس وقت ممکن ہوگی جب عقیدہ توحید کے مطابق حقوق اللہ کی ادائیگی ہوگی اور شرک سے صرف اسی صورت میں بچاؤ ہوگا جب ہمیں عقیدۂ توحید کی مکمل سمجھ آئے گی اور توحید کی سمجھ کیلئے تدبرِ قرآن لازمی مرحلہ ہے۔

مسلمان کا سب سے قیمتی سرمایہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، عقیدۂ توحید کی تفصیلات یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ،عظمت وصفات ،حقوق کی پہچان اور عبادات ومعاملات میں اسوۂ رسول ﷺ کی بنیاد جاننے کیلئے قرآنِ کریم اولین ذریعہ ہے۔قرآنِ کریم غیر متنازعہ کتاب ہے اور دیگر انسانی فلسفوں سے بے نیاز کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تدبرِ قرآن علمائے سوء سے چھٹکارا پانے کیلئے پہلا قدم ہے، اس کے برعکس قرآن

کریم کو فراموش کرنے اور پسِ پشت ڈالنے والا ساری عمر دیگر کتب میں اُلجھا رہتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اسباقِ توحید اور ردِّ شرک کو کس طرح سمجھا اور سمجھایا جائے تو المیہ یہ ہے کہ فی زمانہ حق بات کہنے سے کترایا جاتا ہے، اعتماد کا فقدان ہے اور تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ توجہ اس بات پر نہیں ہوتی کہ کیا کہا جا رہا ہے بلکہ پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کہنے والا ہم مسلک ہے بھی یا نہیں؟ ان حالات میں بہتر طریقہ یہی ہے کہ قرآن کریم سے براہِ راست استفادے کی راہ اپنائی جائے۔ فرض عبادات کی ادائیگی، روٹی روزی کی بھاگ دوڑ، حقوق العباد کی ادائیگی اور ضروری آرام وسکون کے بعد اعمالِ صالحہ کیلئے آج کے حالات میں سب سے بہتر مصروفیت یہی ہے کہ ہر مسلمان ہنگامی اور جنگی بنیادوں پر کچھ عرصے یکسو ہو کر صرف کتاب اللہ پر غور و فکر کرے اور اسوۂ رسول ﷺ سے وضاحت اور رہنمائی حاصل کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ روزِ قیامت ہم ان لوگوں میں شامل ہوں جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ شکایت کریں گے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا o (الفرقان 25 آیت 30)

(ترجمہ:) اور رسول کہے گا کہ اے میرے پروردگار ! بے شک میری امت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

قاری کو سوچنا چاہئے کہ یہ دعوت مفاد پرستی کی خاطر ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف راغب کرنے کیلئے نہیں دی جا رہی بلکہ مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا اپنے رب سے ٹوٹا ہوا تعلق اور رابطہ بحال ہو جائے یہ تعلق بحال ہوگا تو حرم شریف میں کی جانے والی بیک وقت لاکھوں لوگوں کی دعائیں ان شاء اللہ قبول ہوں گی۔ ہمیں اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ مخالفین اسلام پر ہم نہ صرف حجت قائم کر سکیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست مدد کے حقدار بھی بن سکیں کیونکہ جب ہم آپس میں ایک ہونگے تب ہی بیرونی مخالفین سے نمٹ سکیں گے اور معترضینِ اسلام کا سامنا (Face) کر سکیں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں عقیدہ توحید اور دینِ اسلام کے مطالبوں کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، ہماری عبادات کو مسنون بنائے اور شرف قبولیت بخشے اور اللہ تعالیٰ کے غلاموں کو حقِ غلامی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام انسانوں خصوصاً مسلمانوں کی خیر خواہی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ یارب العالمین۔

(اس مضمون کی تیاری میں چند مخلص ساتھیوں کا تعاون شامل ہے، ان سب کو اپنی نیک دعاوں میں ضرور یاد رکھیں۔)

ایک اہم حدیث کی تشریح اور وضاحت

حافظ محمد سلیم [1]

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: هَلَكْتُ، قَالَ: وَمَا شَأْنُكَ؟ قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي فِي رَمَضَانَ، قَالَ: هَلْ تَجِدُ مَا تُعْتِقُ رَقَبَةً قَالَ: لَا، قَالَ: فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ قَالَ: لَا، قَالَ: فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُطْعِمَ سِتِّينَ مِسْكِينًا قَالَ: لَا أَجِدُ، فَأُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَقٍ فِيهِ تَمْرٌ، فَقَالَ: خُذْ هَذَا فَتَصَدَّقْ بِهِ فَقَالَ: أَعَلَى أَفْقَرَ مِنَّا؟ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا أَفْقَرُ مِنَّا، ثُمَّ قَالَ: خُذْهُ فَأَطْعِمْهُ أَهْلَكَ [2]

ترجمہ:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں تو ہلاک ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے صحبت کر لی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] مفتی المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر، کراچی

[2] صحیح بخاری: كتاب كفارات الايمان باب يعطي في الكفارة عشرة مساكين قريبا كان أو بعيدا ،صحیح مسلم : كتاب الصيام باب تغليظ تحريم الجماع في نهار رمضان على الصائم ووجوب الكفارة الكبرى فيه وبيانها وأنها تجب على الموسر والمعسر وتثبت في ذمة المعسر حتى يستطيع

فرمایا کہ بیٹھ جا! وہ بیٹھ گیا، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک ٹوکرا کھجور لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لے جا اور اس کو صدقہ کر۔ اس نے کہا کہ اپنے سے زیادہ محتاج ان دو پہاڑی کے درمیان کسی اور کو نہیں پاتا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اپنے گھر والوں کو کھلا دے۔

حدیث سے مستنبط مسائل:

مذکورہ حدیث سے جن مسائل کا علم ہوتا ہے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مسئلہ 1:

صحابہ کرام سے جب بھی کبھی کوئی غلطی دانستہ یا نادانستہ طور پر ہوجاتی تھی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسئلہ کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی وحی کے بغیر لب کشائی نہیں کرتے تھے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ''وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰىؕ ۝۳ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰىۙ ۝۴ ''(النجم:3،4)

یعنی: وہ اپنی خواہش نفس سے کچھ بھی نہیں کہتے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔

نیز تمام مسلمانوں کے لئے اس میں یہ پیغام بھی ہے کہ مسئلہ کے صحیح حل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف یعنی اللہ کی وحی کی طرف جو کہ قرآن وسنت کی صورت میں قیامت تک کے لئے محفوظ ہے، رجوع کرنا چاہئے تا کہ مسئلہ حل ہوجائے۔

مسئلہ 2:

مذکورہ روایت میں وہ شخص جس نے ماہ رمضان میں بحالت صیام اپنی اہلیہ سے صحبت کر لی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر یوں مخاطب ہوا۔ ''ھلکت''۔ میں ہلاک ہوگیا۔ یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سائل سے یہ معاملہ بھول چوک سے نہیں ہوا بلکہ جان بوجھ کر شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ہوا تھا۔ اگر چہ لاعلمی ونسیاناً بھی ایسا عمل سرزد ہوجائے تو اس کا بھی یہی کفارہ ہے جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔

مسئلہ 3:

مذکورہ روایت میں سائل سے اس فعل کے سرزد ہونے کا تعلق رمضان سے ہے، جس کا واضح معنی یہ ہے کہ

رمضان کے علاوہ اگر کسی اور مہینے میں بحالت صیام یہ فعل زوجین سے سرزد ہوتو ان پر یہ کفارہ نہیں اسی طرح اگر زوجین میں سے کوئی ایک رمضان کے روزوں کی قضاء رکھا ہوا ہو۔اور بحالت صیام مباشرت کر لیتے ہیں تو بھی ان پر جو رمضان کے مہینے میں کفارہ لاگو ہوتا ہے وہ نہیں ہوگا کیونکہ حدیث میں موجود کفارہ کا تعلق ماہ رمضان سے ہے۔جیسا کہ حدیث میں ''وقعت علی امراتی فی رمضان'' کے الفاظ سے واضح ہے

مسئلہ:4

رمضان میں بحالت صیام بغیر مباشرت یعنی ازدواجی تعلقات کے بغیر احتلام کا ہوجانا یا مذی کا خروج یا منی کا خروج کسی اور صورت میں ہوتو اس پر بھی یہ کفارہ عائد نہیں ہوگا جو حدیث میں مذکور ہے۔جس کی دلیل میں موجود الفاظ ''وَقَعتُ عَلیٰ امرَأَتِي'' ہے۔

مسئلہ:5

میاں بیوی اگر دونوں ہی روزے سے ہوں اور مباشرت میں بھی دونوں کی مرضی شامل ہوتو کفارہ دونوں پر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

مسئلہ:6

ایک غلام آزاد کرنا،لگاتار دو مہینے روزے رکھنا یا 60 مسکینوں کو کھانا کھلانا،یہ کفارہ اس شخص پر لازم ہے جس نے رمضان کے مہینے میں روزے کی حالت میں جان بوجھ کر یا بھول کر اپنی اہلیہ سے ہمبستری کی ہو۔کفارہ دینے والا اگر صاحب استطاعت نہ ہوتو پھر بیت المال سے اس کا مسئلہ حل کرنا چاہئے اور اگر بیت المال بھی نہ ہوتو عامۃ المسلمین کو چاہئے کہ ایسے شخص کی مدد کی جائے تاکہ اس کیلئے کفارہ دینا آسان ہوسکے۔

مسئلہ:7

بعض لوگ روزہ کی حالت میں قصداً کھانے پینے والے پر بھی قیاساً یہ کفارہ عائد کرتے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہے۔کیونکہ یہاں قیاس و مقیس علیہ میں کوئی نسبت نہیں ہے۔البتہ ایسا شخص توبہ واستغفار کرے اور ایک روزہ بعد از رمضان قضاء کے طور پر رکھے۔لہذا مذکورہ کفارہ صرف اس شخص پر ہی ہے جس کی بقدر تفصیل وضاحت کردی گئی ہے۔

نوٹ: بعض لوگوں کا سنن ابی داؤد کی ایک ضعیف روایت (جس نے جان بوجھ کر روزہ چھوڑا وہ سارا زمانہ روزہ رکھتا رہے اس کی قضاء نہیں۔) کی بنیاد پر یہ کہنا کہ جان بوجھ کر روزہ توڑنے والے پر کسی قسم کی قضاء نہیں ہے۔ یہ مؤقف حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔

مزید ان مسائل سے ایک اور مسئلہ سمجھنا آسان ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں موجود الفاظ میں ایک ایک لفظ بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اس طرح سے مسائل کا استنباط کرنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ اور یہی منہجِ سلف اور فہم محدثین ہے۔

عورتوں کا مسجد میں اعتکاف کرنا

''خواتین کے اعتکاف سے متعلق مذکورہ تحریر ایک حنفی مفتی صاحب کے فتویٰ کے جواب میں ہے، ''البیان'' نے رمضان کی مناسبت اور قارئین کے افادہ کے لئے صرف اس فتویٰ کے جواب کا حصہ ہدیہ قارئین کیا ہے۔''

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں مسجد میں ایک جگہ کو عبادت کے لئے مختص کرنا اعتکاف کہلاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ (البقرة:182)

یعنی اور اگر تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو پھر بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔

آیت مبارکہ اس باب میں نص صریح ہے کہ مسجد کے علاوہ اعتکاف درست نہیں۔ چاہے اعتکاف کرنے والا مرد ہو یا عورت، مسجد میں اعتکاف کرے۔ اس بارے میں فقہاء ومحدثین نے مختلف انداز سے مسئلہ کی وضاحت کی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے۔ **باب اعتکاف المستحاضة** اور یہ روایت لائے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا، قَالَتْ: "اعْتَكَفَتْ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امْرَأَةٌ مِنْ أَزْوَاجِهِ مُسْتَحَاضَةٌ"۔ [1]

یعنی: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ کی ازواج میں سے ایک بیوی جو کہ

---

[1] صحیح بخاری :2037

مستحاضہ تھیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھی تھیں۔

یہی روایت امام ابوداؤد سنن ابی داؤد میں **باب فی المستحاضة تعتکف** کے تحت اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی سنن ابن ماجہ میں **باب المتحاضة تعتکف** کے تحت ذکر کی ہے، جس سے محدثین کے مسلک کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بلا کراہت عورتوں کے مسجد میں اعتکاف کو درست قرار دیتے ہیں۔

بعض لوگوں نے صحیح بخاری میں مروی روایت جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کے جب مسجد میں خیمہ دیکھے تو انہیں اکھاڑنے کا حکم دیا۔ صحیح بخاری میں اس روایت کا ذکر باب اعتکاف النساء کے تحت اس طرح ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَعْتَكِفُ فِي العَشْرِ الأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ، فَكُنْتُ أَضْرِبُ لَهُ خِبَاءً فَيُصَلِّي الصُّبْحَ ثُمَّ يَدْخُلُهُ، فَاسْتَأْذَنَتْ حَفْصَةُ عَائِشَةَ أَنْ تَضْرِبَ خِبَاءً، فَأَذِنَتْ لَهَا، فَضَرَبَتْ خِبَاءً، فَلَمَّا رَأَتْهُ زَيْنَبُ ابْنَةُ جَحْشٍ ضَرَبَتْ خِبَاءً آخَرَ، فَلَمَّا أَصْبَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى الأَخْبِيَةَ، فَقَالَ: مَا هَذَا؟ فَأُخْبِرَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلْبِرَّ تُرَوْنَ بِهِنَّ فَتَرَكَ الِاعْتِكَافَ ذَلِكَ الشَّهْرَ، ثُمَّ اعْتَكَفَ عَشْرًا مِنْ شَوَّالٍ۔[1]

ترجمہ: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے تھے، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک خیمہ نصب کر دیتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کی نماز پڑھ کر اس میں داخل ہوتے، پھر حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے خیمہ نصب کرنے کی اجازت مانگی، انہوں نے اجازت دیدی تو حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی ایک خیمہ نصب کیا، جب زینت بن جحش رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو انہوں نے بھی ایک دوسرا خیمہ نصب کیا۔ جب صبح ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند خیمے دیکھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ خیمے کیسے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ بیان کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تم ان میں نیکی سمجھتے ہو؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ میں اعتکاف چھوڑ دیا، پھر شوال کے ایک عشرہ میں اعتکاف کیا۔

---

[1] صحیح بخاری :کتاب الاعتکاف ،باب اعتکاف النساء

اس روایت سے بعض مفتی صاحبان نے یہ مفہوم تراشا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے خیمے اکھاڑ دیئے تھے لہذا عورتوں کو مسجد میں اعتکاف کو اجازت نہیں دی جاسکتی، حالانکہ یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے باب اعتکاف النساء کے تحت ذکر کی ہے یعنی وہ تو مسئلے کا اثبات فرماتے ہیں۔اور مفتی صاحب نفی فرماتے ہیں نیز صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی مروی ہے ثم اعتکف ازواجه بعده (صحیح بخاری:2026) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج نے مسجد میں اعتکاف کیا۔اور غلط مفہوم تراشنے والے اس سے نفی ثابت کرر ہے ہیں۔

اگر اکھاڑنے کی علت یہی ہوتی کہ جائز نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ عورتوں کیلئے مسجد میں اعتکاف نہیں ہے بلکہ گھر میں ہے لہذا وہ گھر میں اعتکاف کریں، جولوگ مسجد میں اعتکاف سے منع کرتے ہیں اور گھر میں جائز کہتے ہیں۔کیا وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح فرمان کی روشنی میں ایسا دکھا سکتے ہیں۔جواب یقیناً نفی میں ہے تو حدیث کا مفہوم نہ بگاڑا جائے۔

بلکہ حدیث تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بیوی کی دیکھا دیکھی، دیگر ازواج نے بھی مسجد میں اعتکاف کی غرض سے خیمے لگانے شروع کئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أَلْبِرَّ تُرَوْنَ بِهِنَّ یعنی کیا نیکی اس چیز کا نام ہے، معنی نیکی یہ نہیں۔ بلکہ کسی کی ریس کرتے ہوئے عمل کیا جائے یا میرا قرب حاصل کرنے کے لئے یہ عمل کیا جائے درست نہیں۔

لہذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس عمل سے باز رکھا۔محدثین نے اس کی اور توجیہ بھی کی ہے لیکن یہ کسی نے نہیں کہا کہ عورت کا اعتکاف مسجد میں درست نہیں تھا۔اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کردیا۔نیز امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں اس مسئلے کی تحقیق کو مزید وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: "فِي المرْأَةِ إِنَّهَا إِذَا اعْتَكَفَتْ ثُمَّ حَاضَتْ فِي اعْتِكَافِهَا، إِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى بَيْتِهَا. فَإِذَا طَهُرَتْ رَجَعَتْ إِلَى المسْجِدِ. أَيَّةَ سَاعَةٍ طَهُرَتْ. ثُمَّ تَبْنِي عَلَى مَا مَضَى مِنَ اعْتِكَافِهَا"۔ اگر عورت اعتکاف کرے پھر اس کو حیض آجائے تو وہ اپنے گھر چلی جائے پھر جب پاک ہو مسجد میں آجائے اور تاخیر نہ کرے اور سابقہ اعتکاف پر بناء کرے۔اس کو شمار کرے (یعنی جو ایام حیض کے سبب سے رہ گئے ہیں اس کی قضاء

دینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ بامر اللہ اس کی مکلف نہیں تھی۔)

مزید اس مسئلے میں جمہور محدثین ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ فرماتے ہیں کہ عورت مسجد ہی میں اعتکاف کرے، گھر میں اعتکاف شرعاً صحیح نہیں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ، امام ثوری رحمھما اللہ فرماتے ہیں کہ عورت گھر کی مسجد میں اعتکاف کرے محلہ کی مسجد میں اعتکاف نہ کرے۔ امام صاحب کے اس فرمان کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ عورت کا مسجدِ جامع میں اعتکاف کرنا حرام ہے یا مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ بعض متعصبین مقلدین کا خیال ہے۔

ہم علامہ علاء الدین کاسانی رحمہ اللہ کا تبصرہ بدائع الصنائع کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں۔ وہ امام صاحب کا موقف صحیح توجیہ کے ساتھ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَرَوَى الْحَسَنُ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَعْتَكِفَ فِي مَسْجِدِ الْجَمَاعَةِ وَإِنْ شَاءَتْ اعْتَكَفَتْ فِي مَسْجِدِ بَيْتِهَا، وَمَسْجِدُ بَيْتِهَا أَفْضَلُ لَهَا مِنْ مَسْجِدِ حَيِّهَا وَمَسْجِدُ حَيِّهَا أَفْضَلُ لَهَا مِنْ الْمَسْجِدِ الْأَعْظَمِ وَهَذَا لَا يُوجِبُ اخْتِلَافَ الرِّوَايَاتِ، بَلْ يَجُوزُ اعْتِكَافُهَا فِي مَسْجِدِ الْجَمَاعَةِ عَلَى الرِّوَايَتَيْنِ جَمِيعًا بِلَا خِلَافٍ بَيْنَ أَصْحَابِنَا وَالْمَذْكُورُ فِي الْأَصْلِ مَحْمُولٌ عَلَى نَفْيِ الْفَضِيلَةِ لَا عَلَى نَفْيِ الْجَوَازِ تَوْفِيقًا بَيْنَ الرِّوَايَتَيْنِ وَهَذَا عِنْدَنَا.[1]

یعنی: حسن بن زیاد ابوحنیفہ سے بیان کرتے ہیں کہ عورت مسجد جامع میں اعتکاف کرے اور اگر چاہے اپنے گھر کی مسجد میں اعتکاف کرے، اس کا گھر کی مسجد میں اعتکاف اس کے محلے کی مسجد میں اعتکاف سے افضل ہے۔ اور محلے کی مسجد میں اعتکاف اس کے لئے بڑی مسجد میں اعتکاف سے بہتر ہے، اس سے امام صاحب کے اقوال کے درمیان اس حوالے سے اختلاف ثابت نہیں ہوتا، بلکہ دونوں روایتوں سے ہمارے اصحاب کے نزدیک بلا اختلاف مسجد جماعۃ میں اعتکاف جائز ہے۔ کتاب الاصل میں مذکور جو کچھ ہے وہ فضیلت کی نفی پر محمول ہے نہ کہ جواز کی نفی پر۔ ہمارے نزدیک ان اقوال کے درمیان توجیہ وتوفیق یہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کا مسجد میں اعتکاف کرنا شرعاً بلا کسی کراہت کے جائز ہے۔

---

[1] بدائع الصنائع :کتاب الاعتکاف، فصل رکن الاعتکاف

زکوٰۃ

فرضیت، مصارف اور مسائل

عثمان صفدر [1]

زکوۃ کی تعریف:

لفظ ''زکوۃ'' کا لغوی مفہوم پاکیزگی اور اضافہ ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس عبادت سے انسان کا مال حلال اور پاک ہوجاتا ہے، اور انسان کا نفس بھی تمام گناہوں کی آلودگی سے پاک اور صاف ہوجاتا ہے۔

شریعت اسلامی میں زکوۃ کا معنی ہے:

خاص اموال میں جب وہ نصاب تک پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں سے مخصوص حصہ نکال کر مخصوص مستحقین تک پہنچانا۔

اس تعریف سے پانچ چیزیں واضح ہوتی ہیں:

1. زکوۃ تمام اموال میں سے نہیں نکالی جائیگی، بلکہ صرف چند خاص اموال ہیں جن پر زکوۃ لاگو ہوتی ہے۔ ان کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔
2. ہر کم وزیادہ مال و دولت پر زکوۃ نہیں ہے بلکہ ایک خاص مقدار پر زکوۃ کا نفاذ ہوگا، یہ مقدار ہر مال کے

---

[1] مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

لحاظ سے مختلف ہے، مثلاً مویشیوں میں سے بکری، گائے بھینس اور اونٹ وغیرہ میں تعداد کا خیال رکھا گیا ہے اور ہر ایک میں الگ الگ تعداد مقرر کی گئی ہے، اسی طرح کھیتی باڑی میں فصل کے وزن کو اور سونا چاندی میں قیمت کو معیار بنایا گیا ہے۔

اس مقدار میں شریعت نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ صاحب مال پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالا جائے اور اتنی مقدار پر زکوۃ فرض کی گئی ہے کہ صاحب مال با آسانی اسے ادا کر سکتا ہے۔

3. یہ بات بھی شریعت کی آسانی اور سماحت کا مظہر ہے کہ مال کے اس خاص مقدار کو پہنچتے ہی زکوۃ فرض نہیں ہوتی بلکہ زکوۃ کی فرضیت کے لئے ضروری ہے کہ اس مقدار پر ایک سال گزر جائے۔ یعنی اگر دوران سال مال کی اس خاص مقدار میں کمی واقع ہو جائے تو زکوۃ کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے۔

4. صاحب مال پر زکوۃ صرف اتنی فرض کی گئی جو ہر صاحب نصاب بڑی آسانی سے اور راضی خوشی ادا کر سکتا ہے، یعنی پورے مال کا صرف ڈھائی فیصد حصہ بطور زکوۃ کے فرض کیا گیا جو کہ بقیہ ساڑھے ستانوے فیصد مال کے سامنے کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یقیناً یہ اللہ تعالی کا اس امت پر احسان ہے، اگر یہی زکوۃ جمیع مال کا پچاس فیصد ہوتی تو یقیناً صاحب مال کے لئے بڑی مشقت اور حرج کا سامان ہوتی، لیکن اللہ رب العزت نے اس امت کے ساتھ خصوصی رحمت کا برتاؤ کرتے ہوئے صرف ڈھائی فیصد تک زکوۃ کو محدود رکھا۔

5. زکوۃ کے مصارف خاص ہیں، اور اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بڑی وضاحت کے ساتھ ان کا بیان کر دیا ہے، یہ آٹھ مصارف ہیں جہاں پر زکوۃ خرچ کی جا سکتی ہے، اس کے علاوہ کسی اور جگہ زکوۃ کا مال دینے سے زکوۃ کی ادائیگی نہ ہوگی۔ ان مصارف کا بیان ان شاء اللہ اگلی سطور میں ہوگا۔

زکوۃ کی فرضیت واہمیت:

نماز کے بعد ''زکوۃ'' دین اسلام کا انتہائی اہم رکن ہے۔ قرآن مجید میں بیاسی مرتبہ اس کا تاکیدی حکم آیا ہے۔ زکوۃ نہ صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض ہے بلکہ اس سے پہلے بھی تمام امتوں پر فرض کی گئی تھی۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾[البقرة: 43]

ترجمہ: ''اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔

قرآن مجید میں اللہ تعالی نے زکوۃ ادا کرنے والوں کو سچا مومن قرار دیا ہے:

﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾[الأنفال: 3، 4]

ترجمہ: جو کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں ان کے بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت فرمایا تھا: ''انہیں اس بات کا بھی علم دینا کہ اللہ تعالی نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی''۔ [1]

فرضیت زکوۃ کی حکمتیں اور فوائد

زکوۃ کی صحیح طور پر ادائیگی کے معاشرہ پر، زکوۃ ادا کرنے والے کے نفس اور مال پر بہت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

1. زکوۃ، مال میں اضافہ کا سبب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ﴾[الروم: 39]

ترجمہ: ''اور جو کچھ صدقہ زکوۃ تم اللہ تعالیٰ کا منہ دیکھنے (اور خوشنودی کے لئے) دو تو ایسے لوگ ہی ہیں اپنا دوچند کرنے والے ہیں۔

2. انسان کے نفس اور مال کی پاکیزگی کا باعث ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾[التوبة: 103]

ترجمہ: ''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے، جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں اور

---

[1] بخاری (1331) مسلم (19)

ان کے لئے دعا کیجئے‘‘۔

3 غریبوں کے دل سے امراء کے خلاف حقد وحسد کے جذبات ختم کرنے کا سبب ہے۔

4 معاشرہ میں تعاون اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھانے میں معاون ہے۔

5 حصول رحمت کا سبب ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ﴾ [الأعراف: 156]

ترجمہ: ’’اور میری رحمت تمام اشیا پر محیط ہے تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام ضرور لکھوں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں‘‘۔

6 نصرت الٰہی کا سبب ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ﴾ [الحج: 40، 41]

ترجمہ: ’’جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بیشک اللہ تعالٰی بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوتیں دیں‘‘۔

زکوۃ ادا نہ کرنے کا حکم

اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ زکوۃ کے وجوب کا انکار کرنے والا شخص کافر ہے، البتہ وہ شخص جو زکوۃ کے وجوب کا اقرار تو کرتا ہو لیکن زکوۃ ادا نہ کرے وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے، اللہ تعالی نے ایسے افراد کے بارے میں سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ﴾ [التوبة: 34، 35]

ترجمہ: ’’اور جو لوگ سونا چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک

عذاب کی خبر پہنچا دیجئے۔ جس دن اس خزانے کو آتش دوزخ میں تپایا جائے گا پھر اس دن ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جسے تم نے اپنے لئے خزانہ بنا رکھا تھا، پس اپنے خزانوں کا مزہ چکھو"۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "کسی شخص کو اللہ تعالی نے مال سے نوازا پھر اس نے اس مال کی زکوۃ ادا نہیں کی تو اس کے مال کو قیامت کے دن سانپ کی شکل کا بنایا جائے گا جس کی آنکھوں کے اوپر نکتے ہوں گے، وہ سانپ اس کے گلے میں طوق بن جائے گا اور اس کے جبڑوں کو دبوچ کر کہے گا "میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ"۔ [1]

زکوٰۃ کس پر واجب ہے؟

زکوۃ ہر اس شخص پر واجب ہے جس میں درج ذیل شرائط پائی جائیں:

1. **اسلام:** لہذا کافر پر زکوۃ واجب نہیں، اور نہ ہی کافر کے مال کی زکوۃ قبول کی جائیگی۔
2. **آزادی:** یعنی وہ شخص آزاد ہو، غلام پر زکوۃ واجب نہیں۔
3. **ملکیت:** وہ اس مال کا مالک ہو، لہذا ایسا مال جس کا وہ شخص مالک نہ ہو اس کی زکوۃ ادا نہیں کرے گا، جیسے امانت یا رہن کے طور پر رکھوائے گئے مال پر وہ زکوۃ ادا نہیں کرے گا۔
4. **نصاب:** یعنی اس کے پاس اتنا مال ہو جو نصاب تک پہنچ جائے، اور نصاب سے مراد وہ کم از کم حد ہے جس تک پہنچنے کے بعد مال پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔
5. اس مال پر ایک سال گزر جائے۔ البتہ زرعی پیداوار میں یہ شرط نہیں ہے بلکہ جب بھی فصل ہوگی اس میں سے زکوۃ ادا کرنا واجب ہے، چاہے سال میں دو فصلیں ہوں یا اس سے زیادہ یا کم۔
6. اس کا مال پاکیزہ ہو، حرام مال کی زکوۃ نہیں ہے۔

جن چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے

سونا چاندی اور جو اس کے متبادل ہو یعنی کرنسی۔

---

[1] صحیح بخاری 1338

سونے کا نصاب:

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سونے پر اس وقت تک زکوۃ نہیں جب تک تمہارے پاس بیس (۲۰) دینار نہ ہوں، جب تمہارے پاس بیس دینار ہوں تو اس میں سے آدھا دینار زکوۃ ادا کرو''۔ [1]

بیس دینار کا وزن پچاسی (۸۵) گرام ہے، جو کہ تقریباً ساڑھے سات تولہ بنتے ہیں۔

چاندی کا نصاب:

ابوسعید خدری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پانچ اوقیہ سے کم (چاندی) پر زکوۃ نہیں''۔ [2]

ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے، تو پانچ اوقیہ دوسو درہم کے برابر ہیں، اور دوسو درہم کا وزن پانچ سو پچانوے (۵۹۵) گرام ہے جو کہ تقریبا پچاس تولہ بنتے ہیں۔

زیورات کی زکوۃ:

زیورات کی زکوۃ کے حوالہ سے علماء میں اختلاف ہے، صحابہ کرام میں سے عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، عائشہ صدیقہ، اسماء بنت ابی بکر، جبکہ تابعین کی ایک بڑی جماعت جن میں سے سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، ابن سیرین، زہری رحمہم اللہ، جبکہ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک وہ زیورات جو عورت کے اپنے استعمال کے ہوں ان پر زکوۃ نہیں ہے، جبکہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زیورات پر زکوٰۃ واجب ہے۔

موجودہ دور کے اکثر علماء کرام کا یہی قول ہے کہ احتیاط کا تقاضہ ہے کہ زیورات کی زکوۃ ادا کی جائے جب وہ نصاب کو پہنچ جائیں یعنی ساڑھے سات تولہ سونا ہو یا پچاس تولہ چاندی ہو اور ان پر سال گزر

---

[1] سنن ابوداود (1572) اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے، لیکن یہ حدیث علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً صحیح ثابت ہے، اور چونکہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں لہذا یہ مرفوع کے حکم میں آتی ہے۔

[2] سنن نسائی (2445)

جائے۔ اگر زیورات کی زکوۃ قیمت کے حساب سے دی جائے گی تو اس میں زیورات کی حالیہ قیمت کا اعتبار ہوگا اس کی اصل قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

کرنسی کا نصاب:

کرنسی سونا اور چاندی کا متبادل ہے، کیونکہ گزشتہ ادوار میں سونا اور چاندی بطور قیمت کے استعمال ہوتے تھے، موجودہ دور میں کرنسی بطور قیمت کے استعمال ہوتی ہے۔

کرنسی کے نصاب کا اندازہ سونا اور چاندی میں سے سستی جنس کے نصاب سے لگایا جائے گا، اور موجودہ دور میں چونکہ چاندی سونے کی نسبت سستی ہے لہذا کرنسی کا نصاب چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر ہوگا، یعنی پچاس تولہ چاندی کی جو موجودہ قیمت ہے وہ کرنسی کا نصاب ہے۔

وضاحت:

زیورات کی قیمت کو کرنسی کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا، بلکہ زیورات کا نصاب وزن ہے اور کرنسی کا نصاب قیمت ہے، یعنی اگر کسی شخص کے پاس چار تولہ سونے کے زیورات ہوں اور ان کی قیمت دو لاکھ روپے ہو تو وہ اس پر زکوۃ ادا نہیں کرے گا کیونکہ نصاب مکمل نہیں ہے، سونے کے زیورات ساڑھے سات تولہ ہوں تو زکوۃ واجب ہوگی۔

شیئرز:

ایسی کمپنی جس کا کاروبار حلال ہو اس کے حصص کی خرید وفروخت جائز ہے جب اس خرید وفروخت اور تبادلہ میں جوا شامل نہ ہو۔

شیئرز پر بھی زکوۃ واجب ہے، اور اس کی ادائیگی کا طریقہ کار یہ ہے کہ شیئرز کی حالیہ قیمت اور وہ منافع جو سارا سال اس سے حاصل ہوا ہے کو جمع کیا جائے اور پھر اخراجات نکال کر باقی رقم سے زکوۃ ادا کر دی جائے۔

بانڈز:

بانڈز ایسے قرضہ جات کی رسید کو کہتے ہیں جو ایک انویسٹر کسی کمپنی کو ادا کرتا ہے اور کمپنی یہ قرضہ اس شخص کو ایک خاص مدت میں مخصوص منافع کے ساتھ ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ بانڈز کا کاروبار حرام ہے،

کیونکہ اس میں قرضہ پر ایک مخصوص منافع لیا جاتا ہے جو کہ سود ہے، لیکن علماء کے نزدیک سود کو نکال کر بانڈز کی اصل رقم پر زکوۃ ادا کرنا واجب ہے جب وہ نصاب تک پہنچ جائے، کیونکہ ایسا قرضہ جس کا حصول متوقع ہو اس کو زکوۃ کے نصاب میں شمار کیا جائے گا۔

زرعی پیداوار:

اس سے مراد وہ اجناس ہیں جنہیں کھایا جاتا ہو اور ذخیرہ کیا جاتا ہو۔ لہذا ایسی اجناس جو کھائی نہ جاتی ہوں جیسے کپاس اور وہ اجناس جنہیں ذخیرہ نہ کیا جا سکتا ہو، جیسے سبزیاں وغیرہ، ان پر زکوۃ نہیں، اسی طرح پھلوں پر بھی زکوۃ نہیں ہے، البتہ جب ان پھلوں کو یا سبزیوں وغیرہ کو بیچا جائے اور اس سے حاصل کردہ رقم نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

زرعی پیداوار کا نصاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا کہ: ''پانچ وسق سے کم پر زکوۃ نہیں''۔

وسق ایک پیمانہ ہے جس کا وزن تقریباً 130.56 کلو ہے، اور پانچ وسق 652 کلو بنتے ہیں۔

جن اجناس پر زکوۃ ہے جب وہ نصاب تک پہنچ جائیں اور ان کی سیرابی میں اگر کسان کا خرچہ نہیں آتا یعنی وہ بارش یا نہروں کے ذریعہ سیراب ہوتی ہوں تو ان پر عشر یعنی دس (۱۰) فیصد زکوۃ ہے، اور جن کی سیرابی میں کسان کا خرچہ ہو جیسے ٹیوب ویل وغیرہ تو اس پر نصف العشر یعنی پانچ (۵) فیصد زکوۃ ہے۔

مویشی:

یعنی اونٹ، گائے، اور بکریاں۔ ان کے علاوہ باقی جانوروں پر زکوۃ نہیں، البتہ جب ان کی تجارت کی جائے تو ان پر بھی زکوۃ ہے۔

مویشیوں پر زکوۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ خود چرتے ہوں یا ان کے چارے پر مالک کا خرچہ نہ ہو۔ مویشیوں میں سے ہر جنس کی زکوۃ الگ الگ ہے جس کی تفصیل کتب احادیث میں دیکھی جا سکتی ہے۔

وہ مویشی جنہیں اس غرض سے رکھا جائے کہ ان کا دودھ نکال کر بیچا جائے تو ان جانوروں کے عین پر زکوۃ نہیں بلکہ ان کی دودھ کی تجارت سے حاصل کردہ رقم پر زکوۃ ہے جب وہ نصاب کو پہنچ جائے۔ اسی طرح وہ جانور جنہیں بیچنے کی غرض سے پالا جائے تو ان کے عین پر زکوۃ نہیں بلکہ ان کی تجارت سے حاصل کردہ رقم پر زکوۃ ہے۔

سامان تجارت:

اس سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کی تجارت کی جاتی ہو، چاہے ان کے عین پر زکوۃ ہو یا نہ ہو۔
چاہے وہ اشیاء خرید کر آگے بیچی جائیں چاہے خود تیار کرکے۔
تجارت اور سامان تجارت سے زکوۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دن خاص کرلیا جائے جس میں پورے سال کا آڈٹ (Audit) ہو اور اس میں سال میں حاصل کردہ منافع اور موجودہ سامان تجارت کی حالیہ قیمت، اور ایسے قرضے جن کا حصول متوقع ہو کو جمع کیا جائے اور اس میں سے اخراجات، اور وہ قرضے جو واجب الادا ہیں کو نکال کر باقی رقم سے زکوۃ ادا کردی جائے۔

منافع	200000 (دولاکھ)+
سامان تجارت (موجودہ)	100000 (ایک لاکھ)+
وہ قرضہ جن کا حصول متوقع ہے	50000 (پچاس ہزار)+
کل رقم	350000 (تین لاکھ پچاس ہزار)+
اخراجات	100000 (ایک لاکھ)
واجب الادا قرضہ	50000 (پچاس ہزار)
باقی رقم	200000 (دولاکھ)
زکوۃ	5000 (پانچ ہزار)

وضاحت:

مکان تجارت یعنی وہ جگہ جہاں سے تجارت کی جاتی ہو جیسے دکان، فیکٹری وغیرہ ان کی قیمت پر زکوۃ نہیں اسی طرح جن مشینوں کو سامان کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہو ان پر بھی زکوۃ نہیں۔

کرایہ پر دی گئی اشیاء:

کرایہ پر دی گئی اشیاء کی قیمت پر زکوۃ نہیں بلکہ اس کے کرایہ پر زکوۃ ہے۔ جیسے مکان، فلیٹ، فیکٹری، مشینری، گاڑی وغیرہ کو کرایہ پر دیا جائے تو ان کی قیمت پر زکوۃ نہیں بلکہ ان سے حاصل کردہ کرایہ پر

زکوۃ ہے۔

وضاحت:

زمین ومکان یا جائیداد وغیرہ اگر ایک شخص اپنے استعمال کی نیت سے خریدے تو ان پر زکوۃ نہیں، البتہ اگر اسے بیچنے اور تجارت کی غرض سے خریدے تو اس کی ہر سال کی حالیہ قیمت پر زکوۃ ہوگی، اور اسی طرح اگر اسے کرایہ پر دیدے تو اس کی قیمت پر زکوۃ نہیں ہوگی بلکہ اس کے کرایہ پر زکوۃ ہوگی۔

زکوۃ کے مصارف

شریعت اسلامی میں جب بھی مال کی تقسیم کا معاملہ آیا ہے خاص طور پر وہ مال جس میں مشترکہ حقوق ہوں، تو اس تقسیم کو اللہ تعالی نے بندوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ خود قرآن مجید میں اس کی تقسیم بیان فرمادی، جیسا کہ وراثت کا مال، مال غنیمت اور مال فیٔ کی تقسیم اللہ تعالی نے مکمل وضاحت کے ساتھ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہے، بالکل اسی طرح اللہ تعالی نے زکوۃ کی تقسیم بھی کردی اور وہ افراد اور جہات متعین کردی ہیں جن کے علاوہ کسی اور کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور زکوۃ کے مال میں کچھ حصہ مانگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالی نے اس معاملہ میں کسی کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا چاہے وہ نبی ہو یا کوئی اور ہو، بلکہ خود اس کی تقسیم فرمائی ہے، اگر اس تقسیم کے مطابق تمہارا اس میں حصہ بنتا ہے تو بتادو میں تمہیں دے دوں گا''۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالی نے صدقات کی تقسیم اپنی کتاب میں بیان فرمادی ہے مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ﴾ [التوبة:60] کہ یہ اللہ کی طرف سے فرض کردہ ہے، لہٰذا کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ اسے اللہ تعالی کی بیان کردہ تقسیم کے علاوہ کسی اور جگہ تقسیم کرے''۔[2]

سورۃ توبہ آیت (٦٠) میں اللہ تعالی نے زکوۃ کے آٹھ مصرف بیان کئے ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾

ترجمہ: صدقے صرف فقیروں کے لئے ہیں اور مسکینوں کے لئے اور ان کے وصول کرنے والوں کے

---

[1] سنن ابو داود (1630) [2] احکام القرآن بیہقی (1/ 160)

لئے اور ان کے لئے جن کے دل پر چائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے میں اور قرضداروں کے لئے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے فرض ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ علم و حکمت والا ہے''۔[التوبۃ:60]

ان آٹھ مصارف کی تفصیل درج ذیل ہے:

1 **فقیر:** اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اپنی حاجات پورا کرنے کے لئے کچھ نہ ہو۔

2 **مسکین:** اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ مال یا ذرائع ہوں لیکن وہ اس کی حاجات کے لئے کافی نہ ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ﴾[الكهف : 79]

ترجمہ: ''کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کاج کرتے تھے''۔

تو معلوم ہوا کہ ان مساکین کے پاس کشتی تھی اور وہ کام بھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ مسکین تھے۔

3 **عامل زکوۃ:** یعنی وہ شخص جو زکوۃ جمع کرتا ہے، وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں لے سکتا بلکہ امیر یا حاکم اسے اس زکوۃ میں سے کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔

4 **تالیف قلبی:** یہ وہ واحد مصرف ہے جس میں کسی کافر کو بھی زکوۃ دی جاسکتی ہے۔ اس مصرف میں تین قسم کے افراد شامل ہیں:

- جس کے مسلمان ہونے کی امید ہو۔
- جس کے فتنہ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا ہو۔ چاہے وہ شخص مسلمان ہو یا کافر۔
- وعلاقہ کا بڑا، قبیلہ کا سردار یا کوئی حیثیت رکھنے والا شخص ہو اور دعوت دین میں معاون ہو سکے اسے بھی تالیف قلبی کی خاطر زکوۃ میں سے دیا جاسکتا ہے۔

5 **گردن آزاد کرانا:** اور موجودہ دور میں کسی بے گناہ مسلمان قیدی کی ضمانت کرانا۔

6 **قرضدار:** اس سے مراد ایسا قرضدار ہے جس نے کسی اسراف، فضول خرچی یا کسی گناہ کے کام کے لئے قرض نہ لیا ہو، بلکہ ضرورت کے تحت لیا ہو اور پھر اسے چکانہ سکے۔

7 فی سبیل اللہ:

یہ ایک ایسا مصرف ہے جس میں کافی تفصیل کی ضرورت ہے۔

''فی سبیل اللہ'' نصوص قرآن وحدیث میں دو معنی میں استعمال ہوا ہے:

❂ **عمومی معنی، یعنی ہر وہ نیکی کا کام جو اللہ تعالی کی رضا کی خاطر کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:**

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرة: 261]

ترجمہ: ''جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سے سو دانے ہوں، اور اللہ تعالیٰ اسے چاہے اور بڑھا دے اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔

❂ **خاص معنی، یعنی جہاد۔** جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ [الأنفال: 60]

ترجمہ: ''تم ان کے مقابلے کے لئے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں خوب جان رہا ہے جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں صرف کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا''۔

اسی وجہ سے اہل علم میں اس بات پر اختلاف ہے کہ یہاں کونسا معنی مراد ہے، اور اس بارے میں اہل علم کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: اس سے مراد خاص معنی یعنی جہاد ہے۔

اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے اور جمہور اہل علم بلکہ ائمہ اربعہ کا یہی قول ہے۔

مفسرین کے اقوال:

✪ استاد المفسرین ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جہاں تک اللہ تعالی کے اس فرمان ''فی سبیل اللہ'' کا تعلق ہے تو اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالی کے دین اور اس کی شریعت کی نصرت کے لئے جو قتال کیا جاتا ہے جو کفار سے جہاد ہے اس کے لئے خرچ کرنا۔[1]

✪ ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سبیل اللہ'' سے مراد ہے کہ یہ مال مجاہد کو دیا جائے چاہے وہ مالدار ہی کیوں نہ ہو۔[2]

✪ ابوالحسن الواحدی صاحب تفسیر ''الوجیز'' لکھتے ہیں: ''فی سبیل اللہ'' یعنی مجاہدین اور سرحدوں کی رکھوالی کرنے والے۔[3]

✪ حسین بن مسعود البغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''فی سبیل اللہ'' سے اللہ تعالی کی مراد مجاہدین ہیں، لہذا انہیں بھی اس صدقہ میں حصہ دینا چاہیئے۔[4]

✪ امام قرطبی فرماتے ہیں: ''اس سے مراد غازی اور سرحدوں کی رکھوالی کرنے والے مجاہدین ہیں، اور یہی اکثر اہل علم کا قول ہے''۔[5]

✪ تاج المفسرین امام ابن کثیر رحمہ اللہ بھی اسی موقف کی تائید میں لکھتے ہیں کہ: ''اس سے مراد وہ غازی ہیں جن کے لئے باقاعدہ تنخواہ مقرر نہ ہو''۔[6]

✪ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس سے مراد غازی اور سرحدوں کی رکھوالی کرنے والے مجاہدین ہیں''۔[7]

✪ عبدالرحمن بن ناصر السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ساتواں مصرف: اور یہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے ہیں، اور یہ وہ مجاہدین ہیں جن کے لئے باقاعدہ تنخواہیں مقرر نہ ہوں''۔[8]

---

[1] تفسیر طبری: 14/ 319 [2] تفسیر ابن عطیہ: 3/ 274

[3] تفسیر الوجیز: 289 [4] فتح القدیر: 3/ 272

[5] تفیر القرطبی: 10/ 189 [6] تفسیر ابن کثیر: 4/ 169

[7] فتح القدیر: 3/ 272 [8] فتح القدیر: 3/ 272

یہ چند کبار مفسرین کے اقوال ہیں، اور ان کے علاوہ بھی سلف وخلف کے تمام مفسرین کا یہی قول ہے۔

علماء کے اقوال:

(۱) امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی جو اسے میت کی تکفین میں دیدے، کیونکہ زکوۃ صرف فقراء اور مساکین اور ان افراد کے لئے ہے جن کا اللہ تعالی نے قرآن میں ذکر کیا ہے، میت کے لئے اور مساجد کی تعمیر کے لئے نہیں ہے''۔[1]

(۲) ابن ہبیرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''چاروں ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زکوۃ کو مساجد کی تعمیر اور میت کی تکفین وغیرہ کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ یہ بھی نیکی ہے، لیکن زکوۃ کے مصارف پہلے سے متعین ہیں۔[2]

(۳) ابن قدامہ المقدسی فرماتے ہیں: ''اللہ تعالی کے ذکر کردہ مصارف کے علاوہ زکوۃ کو کسی اور مصرف جیسے مساجد کی تعمیر، پلوں اور سڑکوں کی درستگی اور کنویں کی کھدائی میت کی تکفین وغیرہ کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔ امام ابوداود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ: ''کیا زکوۃ کو میت کی تکفین وتجہیز کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ تو امام احمد نے فرمایا: ''نہیں، اور نہ ہی میت کا قرض اس میں سے ادا کیا جاسکتا ہے''۔[3]

(۴) ابوحنیفہ رحمہ اللہ: ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ایسا غازی ہے جو غنی نہ ہو۔[4]

(۵) ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جہاں تک ''فی سبیل اللہ'' کا تعلق ہے تو اکثر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مجاہد کے لئے خاص ہے، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، اور بعض کا یہ قول ہے کہ یہ صرف غریب مجاہد کے لئے خاص ہے۔[5]

---

[1] المدونہ الکبری: 2 /59

[2] الافصاح108

[3] المغنی : 2 /525

[4] عمدۃ القاری:45/9

[5] فتح الباری:3 / 259

(٦) ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’جہاں تک ’’سبیل اللہ‘‘ کا تعلق ہے تو اس سے مراد یقیناً جہاد ہی ہے۔[1]

دلائل

(1) ’’فی سبیل اللہ‘‘ کا لفظ جب نصوص قرآن وحدیث میں مطلقاً آئے تو اس سے مراد جہاد ہوتا ہے، گویا کہ یہ لفظ اسی کے لئے خاص ہوگیا ہے۔ ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’سبیل اللہ ویسے ہر اس عمل کو کہتے ہیں جو اللہ تعالی کے قریب کردے، لیکن جب یہ مطلقاً آئے تو اس کا معنی جہاد ہی ہوتا ہے، حتی کہ جہاد کے لئے کثرت استعمال کی وجہ سے گویا یہ اسی کے لئے خاص ہوکر رہ گیا ہے۔[2]

(2) اللہ تعالی نے آیت کی ابتدا میں لفظ ’’إنما‘‘ یعنی ’’فقط‘‘ کہہ کر یہ بتایا کہ یہ زکوۃ انہی آٹھ مصارف میں محدود رہے گی، اگر یہاں ’’فی سبیل اللہ‘‘ سے مراد ہر قسم کی نیکی اور فلاح کا کام ہو تو اس قید کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

(3) عربی لغت کا قاعدہ ہے کہ ’’عطف مغایرت چاہتا ہے‘‘ یعنی ان آٹھ مصارف کے درمیان جو حرف ’’وَ‘‘ کا استعمال ہوا ہے اسے عربی گرامر میں ’’حرف عطف‘‘ کہتے ہیں، اور حرف عطف دو الگ الگ چیزوں کے درمیان فرق کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں پر اس کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ سارے مصارف ایک دوسرے سے الگ ہیں، ’’وَ‘‘ کا معنی ہے ’’اور‘‘ جیسا کہ اردو میں کہا جاتا ہے: ’’ابوبکر اور عمر آئے‘‘ تو لفظ ’’اور‘‘ کے ذریعہ دو الگ الگ چیزوں کے درمیان فاصلہ کیا جاتا ہے، یہی استعمال ’’وَ‘‘ کا عربی میں ہے۔ اللہ تعالی نے آٹھوں مصارف کے درمیان ’’وَ‘‘ ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مصرف دوسرے سے مختلف ہے، فقراء کا مصرف الگ ہے، مساکین کا الگ ہے، تالیف قلبی کا الگ، اسی طرح ان سب مصارف کا ’’فی سبیل اللہ‘‘ کے مصرف سے کوئی تعلق نہیں، اگر ’’فی سبیل اللہ‘‘ کا معنی ہر نیکی کرلیا جائے تو فقرا، مساکین کو دینا بھی نیکی ہے پھر اللہ تعالی نے ان کے درمیان ’’وَ‘‘ کا استعمال کیوں کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ ’’فی سبیل اللہ‘‘ ایک الگ مصرف ہے اور وہ مجاہدین ہیں۔

(4) ایک صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ’’مالدار شخص کے لئے پانچ قسم کے حالات کے علاوہ

---

[1] المحلی: 6 /151

[2] النهايه فی غريب الحديث: 2 /145

زکوۃ لینا جائزنہیں، (ان میں سے ایک) جب وہ فی سبیل اللہ غازی ہو''۔[1] تو اس حدیث میں واضح طور پر نبی ﷺ نے ''فی سبیل اللہ'' کے مصرف کو بیان کیا ہے۔

دوسرا قول: اس سے مراد غازی اور فقیر حاجی ہے۔

اس قول کو امام بخاری نے کتاب الزکوۃ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا ورحسن بصری رحمہ اللہ سے تعلیقاً (بغیر سند) روایت کیا ہے،[2] اور حنابلہ کی بعض کتب میں اسے امام احمد کا قول بھی بتایا گیا ہے۔

دلائل:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاریہ صحابیہ نے اپنے شوہر سے کہا کہ: مجھے نبی ﷺ کے ساتھ حج کراؤ، تو اس صحابی نے کہا کہ: میرے پاس تو کوئی سواری نہیں جس پر میں تمھیں حج کرواسکوں، تو صحابیہ نے کہا: تمہارا وہ فلاں گھوڑا ہے، تو صحابی نے کہا: میں اسے فی سبیل اللہ وقف کر چکا ہوں، پھر وہ صحابی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور یہ واقعہ بیان فرمایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اسے اس گھوڑے پر حج کرواؤ گے تو یہ بھی فی سبیل اللہ میں ہوگا''، پھر اس صحابی نے کہا کہ میری بیوی نے کہا ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کے ساتھ حج کرنے کے ثواب کے برابر اور کون سا عمل ہے، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''رمضان میں عمرہ کرنے کا اجر میرے ساتھ حج کرنے کے ثواب کے برابر ہے''۔[3]

(1) ام معقل اسدیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے شوہر نے وصیت کرتے ہوئے اپنا اونٹ فی سبیل اللہ وقف کردیا، پھر ام معقل نے حج کا ارداہ کیا لیکن ان کے پاس سواری نہیں تھی تو نبی ﷺ نے ابو معقل کو حکم دیا کہ وہ یہ اونٹ انہیں دیں اور فرمایا: ''حج ''فی سبیل اللہ'' میں سے ہے''۔[4]

(2) ابولاس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں نبی ﷺ نے حج پر جانے کے لئے صدقہ کے اونٹ عنایت فرمائے تھے۔[5]

---

[1] سنن ابو داود (1635)
[2] صحیح بخاری (کتاب الزکوة، باب قوله تعالى : وفی الرقاب والغارمین۔۔۔)
[3] سنن ابو داود (1990)
[4] سنن دارمی (3304)
[5] مسند احمد (4 /221)

دلائل کا تجزیہ: (1) دلیل کے طور پر پیش کی جانی والی تینوں احادیث ضعیف ہیں۔ (تفصیل کے لئے حاشیہ)[1]

(2) اگر بالفرض ان احادیث کو صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی یہ اس مسئلہ میں دلیل نہیں بن سکتیں، کیونکہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ام معقل رضی اللہ عنہا میں وقف کا بیان ہے زکوۃ کا نہیں، جبکہ مسئلہ مذکورہ زکوۃ کے مصارف کے بیان میں ہے، وقف کے نہیں۔ صاحب تفسیر المنار محمد رشید بن علی رضا لکھتے ہیں: ''ابو معقل رضی اللہ عنہ کا وقف کرنا ایک نفلی صدقہ تھا اور اس کے مصارف میں وہ شرط نہیں ہوتی جو زکوۃ کے مصارف میں ہوتی ہے، بلکہ نفلی صدقہ کے مصارف عام ہیں۔[2]

تیسرا قول: آیت میں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد تمام نیکی اور بھلائی کے کام ہیں۔ لہٰذا زکوۃ کا مال ہر قسم کے رفاہی اور فلاحی کاموں جیسے مساجد کی تعمیر، ہسپتال، سڑکوں کی تعمیر وغیرہ میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔

اس قول کا سلف صالحین میں سے کوئی بھی قائل نہیں، بلکہ متاخرین علماء میں سے چند اس کے قائل رہے ہیں، سب سے پہلے اس قول کو اختیار کرنے والے فخر الدین رازی شافعی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء کی طرف اس قول کو منسوب کیا اور پھر اسے راجح قرار دیا،[3] ان کے بعد متاخرین حنفیہ میں سے بعض نے اسے اختیار کیا، جیسا کہ امام کاسانی نے بدائع الصنائع میں، اور امام آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں۔

---

[1] حدیث ابن عباس: اس کی سند میں ایک راوی عامر الاحول ہے جو کہ صدوق یخطئ ہے، اور یہی روایت صحیح بخاری اور مسلم میں ہے جس کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن اس میں یہ الفاظ نہیں کہ ''اگر تم اسے اس گھوڑے پر حج کرواؤ گے تو یہ بھی فی سبیل اللہ میں ہوگا'' تو معلوم ہوا کہ یہ الفاظ شاذ (یعنی ضعیف) ہیں، امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث ان الفاظ کے علاوہ صحیح ہے''۔

حدیث ام معقل: اس حدیث کی سند اور الفاظ میں شدید اضطراب اور اختلاف ہے اور اس میں جمع بھی ممکن نہیں لہذا حدیث ضعیف ہے، عبید الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے مرعاۃ المفاتیح (3 / 117) میں اس حدیث پر ضعف کا حکم لگایا ہے، اس حدیث کی دو اسناد ہیں، ایک میں مہاجر بن ابراہیم ہے جو کہ مقبول ہے اور یہ توثیق کا سب سے نچلا درجہ ہے، یعنی اس کی روایت بغیر متابعت کے قبول نہیں کی جائیگی، جبکہ دوسری سند میں ابن اسحاق ہے جو کہ مدلس ہے اور اس نے سماع کی صراحت نہیں کی۔

حدیث ابولاس: اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہے جو کہ مدلس ہے اور اس نے سماع کی صراحت نہیں کی، اسی لئے ابن حجر نے تغلیق التعلیق میں اس روایت کے بارے میں توقف اختیار کیا ہے۔

[2] تفسیر المنار (10 / 434)

[3] تفسیر رازی (16 / 113)

اہلحدیث علماء میں سب سے پہلے یہ قول امام صنعانی رحمہ اللہ نے سبل السلام میں اختیار کیا، پھر صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے روضۃ الندیہ میں، ان کے بعد یہ قول کئی علماء نے اختیار کیا، لیکن اکثر علماء نے اسے مرجوح قرار دیا، جیسا کہ عبید الرحمن مبارکپوری نے مرعاۃ المفاتیح میں اس پر سخت تنقید کی ہے اور اس قول کو انتہائی ضعیف قرار دیا ہے[1]

دلائل اور ان کا تجزیہ

(1) ''فی سبیل اللہ'' عام ہے، اور اسے خاص معنی پر محمول کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، جو کہ اس آیت میں موجود نہیں۔

جواب:

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' جب بھی مطلقاً آتا ہے تو اس سے مراد جہاد ہی ہوتا ہے، اور پھر آیت میں ''انما'' کی قید اور حرف ''وٗ'' کا ستعمال بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد خاص معنی ہے نہ کہ عام۔

(2) وہ تمام احادیث جن سے دوسرے قول کے قائلین نے استدلال لیا تھا۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فی سبیل اللہ ایک چیز کے لئے خاص نہیں بلکہ اس میں اور اعمال بھی آتے ہیں۔

جواب:

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ احادیث صحیح ثابت نہیں لہٰذا ان سے استدلال لینا جائز نہیں۔ اگر ان احادیث کو صحیح مان بھی لیا جائے تو ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ''فی سبیل اللہ'' کو ایک خاص معنی پر محمول کرتے تھے، اسی لئے صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے آ کر اس بارے میں سوال کیا، اور نبی ﷺ نے صرف حج کو مزید اس مصرف میں شامل کیا۔

(3) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے مسجد کی تعمیر میں رقم خرچ کی، اور بیت المال میں زکوۃ کا ہی مال جمع ہوتا تھا، اور صحابہ کرام نے عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' تمام بھلائی کے کاموں کو شامل ہے۔

---

[1] مرعاۃ المفاتیح (3/ 118)

جواب:

پہلی بات: یہ ہے کہ قاعدہ اور اصل تو یہ ہے کہ زکوۃ کا مال چند مخصوص مصارف ہی میں استعمال کیا جائیگا، اور عمر رضی اللہ عنہ یقیناً اس قاعدہ سے لاعلم نہیں ہونگے، اور زکوۃ کا مال انہی مصارف میں خرچ کریں گے جن کے لئے وہ مخصوص کیا گیا ہے، البتہ اس کے برعکس یہ بات ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی تعمیر میں زکوۃ ہی کا مال خرچ کیا ہے؟؟۔

دوسری بات: یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بیت المال نہیں تھا بلکہ جو بھی مال آتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے فوراً تقسیم فرمادیتے، بیت المال کا انشاء سب سے پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے ہی کیا تھا، اور اس کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب دارالخلافہ مدینہ میں مال کی کثرت ہوگئی، اور عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں وہ ذرائع جن سے مال آتا تھا وہ بھی زیادہ ہوگئے تھے، عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیت المال میں چھ ذرائع سے مال آتا تھا:

(۱) زکوۃ:

(۲) مال غنیمت: وہ مال جو جنگ کے ذریعہ حاصل ہو۔

(۳) مال فئ: وہ مال جو جہاد میں بغیر جنگ کے حاصل ہو۔

(۴) خراج: وہ مال جو مسلمان ان کفار سے لیتے تھے جو مسلمانوں کے علاقہ میں رہتے اور کھیتی باڑی کرتے تھے، ان سے ایک مناسب نسبت طے کرلی جاتی جسے وہ ہر فصل میں سے ادا کرتے۔

(۵) جزیہ: جو مسلمانوں کے علاقہ میں رہنے والے ایسے کفار سے لیا جاتا جو کھیتی باڑی کے علاوہ کسی اور پیشہ سے منسلک ہوتے۔

(٦) ٹیکس: ایسے کفار سے لیا جاتا جو دارالکفر سے دارالاسلام میں تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ تو یہ کہنا درست نہیں کہ بیت المال میں صرف زکوۃ کا ہی مال آتا تھا، بلکہ زکوۃ کی نسبت دیگر ذرائع سے آنے والا مال زیادہ تھا، اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں ہر ایک کے الگ دیوان قائم کئے تھے، جیسا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ بیت المال میں کئی دیوان تھے مثلاً دیوان الزکوۃ جس میں صرف زکوۃ کا مال رکھا جاتا، اسی طرح دیوان

الجند جس میں جہاد سے حاصل کردہ مال رکھا جاتا، اور دیگر دیوان بھی قائم تھے۔ اس تقسیم سے صاف ظاہر ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے زکوۃ کے مصارف کی خصوصی تقسیم کی وجہ سے اس کا دیوان الگ قائم کیا تھا ،لہٰذا یہ سمجھنا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ''فی سبیل اللہ'' کا معنی عام تھا اور وہ اسے ہر نیکی کے کام پر محمول کرتے تھے، غلط ہے۔

تیسری بات: یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیت المال سے تمام مسلمانوں کو بلا تفریق مخصوص ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا، اور ان میں نبی کریم ﷺ کے اہل بیت اور مالدار مسلمان بھی شامل تھے، جبکہ مالدار مسلمان اور نبی ﷺ کے اہل بیت کے لئے زکوۃ لینا حرام ہے۔

یہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زکوۃ کا مال تو امیر المومنین کے پاس ہوتا تھا پھر وہ آگے اسے مسلمانوں کو ہدیہ کرتے تھے اور اہل بیت کے لئے ہدیہ حرام نہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ لونڈی بریرہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا کہ اسے جو صدقہ ملتا ہے وہ اس کے لئے صدقہ ہے ہمارے لئے ہدیہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امیر المومنین یا خلیفہ زکوۃ کے مال کا مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ مال اس کے پاس بطور امانت ہوتا ہے اور اسے وہیں خرچ کرنا ہوتا ہے جو اس کے جائز مصارف ہیں، جبکہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو جو صدقہ ملتا تھا وہ ان کی ملکیت میں آجاتا تھا پھر وہ اسے جہاں چاہے خرچ کریں۔ لہٰذا اہل بیت کو ملنے والا مال زکوۃ کا ہرگز نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوا کہ زکوۃ کا مال یقیناً دیگر اموال سے الگ رکھا جاتا تھا اور اسے اس کے مخصوص مصارف ہی میں خرچ کیا جاتا تھا۔

خلاصہ کلام

اس مسئلہ میں راجح قول پہلا قول ہے، کہ آیت زکوۃ میں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد خاص معنی ہے اور وہ ہے مجاہدین۔ لہذا مساجد و مدارس کی تعمیر، ہسپتال اور مریضوں کے علاج و معالجہ، سڑکوں کی تعمیر اور دیگر فلاحی کاموں میں جن کا ذکر زکوۃ کے مصارف میں نہیں زکوۃ استعمال کرنا جائز نہیں۔

ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مساجد کی تعمیر اور مدارس کی تعمیر اور اسی طرح سڑکوں، پلوں وغیرہ کی تعمیر

میں زکوۃ استعمال کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ زکوۃ کے آٹھ مصارف میں شامل نہیں۔ [1]

چند ضروری وضاحتیں:

(1) یہاں پر مجاہدین سے مراد وہ مجاہد ہیں جو صحیح منہج پر ہوں اور خالصتاً اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کریں نہ کہ وہ جماعتیں اور ایسے نام نہاد مجاہد جو حکومت کی خاص ایجنسیوں کے ایجنڈے پر عمل کرنے کے لئے جہاد کا علم بلند کریں، جن کے ہاں دوستی اور دشمنی کا معیار قرآن و حدیث اور توحید کے بجائے صرف شہرت اور مطلب براری ہو، جن کا جہاد مشکوک ہو، اور جن کے مالی معاملات پر انگلیاں اٹھتی ہوں۔

(2) جہاد سے مراد صرف جہاد بالسیف نہیں ہے، بلکہ جہاد باللسان، یعنی زبان کا جہاد اور قلم کا جہاد بھی اس میں شامل ہے، اور یہ جہاد قرآن وحدیث کے نصوص سے ثابت ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ [الفرقان: 52]

ترجمہ: ''پس آپ کافروں کا کہنا نہ مانیں اور قرآن کے ذریعے ان سے پوری طاقت سے بڑا جہاد کریں''۔

یہاں قرآن کے ذریعہ جہاد کا حکم دیا گیا ہے جو کہ یقیناً زبان ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اور یہ سورۃ الفرقان کی آیت ہے اور سورۃ الفرقان مکی سورت ہے اور مکہ میں جہاد فرض نہیں ہوا تھا، لہذا اس آیت میں تبلیغ دین ہی کو جہاد قرار دیا گیا ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

'' جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم''

ترجمہ: ''مشرکین سے جہاد کرو اپنی جانوں کے ساتھ اور مال کے ساتھ اور زبانوں کے ساتھ''۔ [2]

لہذا ایسے ادارے، مراکز اور افراد جو معاشرہ میں انسانوں کی رہنمائی اور شرک و بدعت کے خلاف جہاد میں مصروف عمل ہوں ان کے ساتھ زکوۃ کے مال سے تعاون کیا جاسکتا ہے، بلکہ موجودہ دور میں یہ جہاد بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ حالیہ زمانہ میں قوموں کو اسلحہ کے زور سے فتح کرنے کے بجائے نظریات اور افکار کی جنگ لڑی جاتی ہے، اور اس کے نتائج آج ہمیں اپنے معاشرہ پر بھی بھرپور طریقہ سے نظر

---

[1] فتاوى نور على الدرب

[2] سنن ابو داود 2504

آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب رابطہ عالم اسلامی (OIC) کی علماء کمیٹی ''المجمع الفقه الاسلامی'' سے خاص طور پر پاکستان کے حوالہ سے زکوۃ کے متعلق پوچھا گیا تو علماء کمیٹی نے فتوی دیا جو کہ ۲۷ جون ۱۹۸۳ کو جاری ہوا، اس میں مجمع الفقہی الاسلامی نے ایسے اداروں اور مراکز کو زکوۃ کے مصرف فی سبیل اللہ میں سے قرار دیا جو معاشرہ میں جہاد باللسان کا فرض انجام دے رہے ہوں۔

8 مسافر:

اس سے مراد وہ شخص ہے جو حالت سفر میں ہو، چاہے وہ اپنے علاقہ میں کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو حالت سفر میں آفت آجانے کی وجہ سے اس کے لئے زکوۃ لینا جائز ہے۔

والله أعلم

وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه وسلم

تكملة صحيح الاقوال
فی
صيام ستة من شوال

شوال کے چھ روزے

فضیلت، مسائل اور شبہات کا جائزہ

حافظ محمد یونس اثری [1]

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين

کچھ عرصہ قبل شوال کے چھ روزوں کی کراہیت کے حوالے سے ایک کتاب منظر عام پر آئی جو کہ مفتی زرولی صاحب کی تحریر کردہ تھی ، استاد محترم حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے بروقت اس کا علمی اور تحقیقی رد کیا، جو کہ ماہنامہ الحدیث میں شائع ہوا، بعدازاں مقالات میں بھی مطبوع ہو چکا ہے۔ (مقالات : جلد نمبر 2 صفحہ نمبر 322 تا 328) بحمداللہ اب تک فریق مخالف کی طرف سے استاد محترم رحمہ اللہ کے اس مضمون کا کوئی جواب منظر عام پر نہیں آیا۔ استاد محترم رحمہ اللہ نے دو صحیح روایات (حدیث ابی ایوب اور حدیث ثوبان رضی اللہ عنہما) کو پیش کیا اور ان کے حوالے سے چند اعتراضات کا ضمناً جواب بھی دے دیا تھا۔ اور اس موضوع پر بعض دیگر روایات کو اس لئے پیش نہ کیا کہ ان کی سند میں کلام تھا اور یہ دو صحیح روایات (حدیث ابی ایوب اور حدیث ثوبان رضی اللہ عنہما) عمل کے لئے کافی تھیں ۔ ہم اس حوالے سے چند دیگر روایات پیش کر رہے ہیں جنہیں متابعت میں پیش کیا جاسکتا ہے نیز چونکہ معنیً صحیح ہیں اس لئے بھی ان دو صحیح روایات (حدیث ابی ایوب ، حدیث ثوبان رضی اللہ عنہما جیسا کہ آگے آرہی ہیں) کی ضمن میں پیش کیا جا سکتا

[1] مدرس المعهد السلفی کراچی

ہے۔ نیز مفتی زرولی صاحب اوران کے ہم نواؤں کے لئے وہ اس لئے بھی حجت ہیں کہ ان کے یہاں فضائل میں ضعیف روایات قبول کی جاتی ہیں، جس کے حوالے سے بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ ہماری یہ تحریر استاد محترم رحمہ اللہ کی تحریر کے تکملہ کی ہی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ہم اسے اسی نام سے موسوم کرر ہے ہیں۔ اوراس مضمون کے آخر میں شوال کے چھ روزوں کے حوالے سے بعض فقہی مسائل کے بارے میں بھی رہنمائی کردی گئی ہے۔

شوال کے چھ روزوں کی فضیلت یہ ہے کہ رمضان کے روزے رکھنے کے بعد یہ روزے رکھ لئے جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ ایسے ہے کہ جیسے اس نے پورا سال روزے رکھے۔ اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث ملاحظہ فرمائیں:

پہلی حدیث: حدیث ابی ایوب رضی اللہ عنہ

سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

’’ من صام رمضان وا تبعه ستا من شوال كان كصيام الدهر‘‘

ترجمہ:’’جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو یہ ایسا ہے جیسے پورے سال کے روزے ہوں۔‘‘

تخریج الحدیث:

یہ روایت مندرجہ ذیل کتب میں موجود ہے۔

[صحیح مسلم : 1165، سنن ابی داؤد : 2433، جامع ترمذی : 759، سنن ابن ماجۃ : 1716، سنن الدارمی: 1754، مسند احمد: 417/5، 419/5، صحیح ابن خزیمۃ : 1967، صحیح ابن حبان: 3634، سنن الکبری : 292/4، مسند ابی داؤد طیالسی: 595، مسند حمیدی : 384، 385، مصنف عبدالرزاق : 7921، مصنف ابن ابی شیبۃ : 9811، شرح السنۃ: 1780]

یہ روایت صحیح ہے، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابن خزیمۃ، امام ابن حبان، حافظ بغوی، امام ابن القیم اور امام ابن الاثیر وغیرہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ استاد محترم حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’میرے علم کے مطابق کسی امام سے اس روایت کو ضعیف قرار دینا ثابت نہیں ہے۔‘‘[1]

[1] مقالات: 2/322

دوسری حدیث: حدیث ثوبان رضی اللہ عنہ

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”من صام ستة ايام بعد الفطر كان تمام السنة من جاء بالحسنة فله عشر ا مثالها“

ترجمہ: ”جس نے عیدالفطر کے بعد چھ روزے رکھے اس کے لئے اجر میں پورے سال کے روزے ہیں۔ جو کوئی نیکی کرتا ہے اسے اس کا اجر دس گنا ملے گا۔“

تخریج الحدیث:

یہ روایت مندرجہ ذیل کتب میں موجود ہے۔

[سنن ابن ماجۃ: 1715، سنن الدارمی: 1762، صحیح ابن خزیمۃ: 2115، مسند احمد: 280/5 صحیح ابن حبان: 3635، مسند بزار: 4178، السنن الکبری للنسائی: 2874، المعجم الکبیر: 1451، المعجم الاوسط: 7607، شعب الایمان: 3460، 3461، شرح مشکل الآثار: 2349]

یہ روایت بھی سنداً صحیح ہے، امام ابن خزیمۃ، امام ابن حبان رحمہما اللہ سمیت کئی ایک اہل علم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

تیسری حدیث: حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”من صام رمضان وستة ا يام من شوال فكا نما صام السنة كلها“

ترجمہ: ”جس نے رمضان کے روزوں کے بعد چھ روزے رکھے اور پھر شوال کے چھ روزے رکھے، گویا کہ اس نے پورے سال کے روزے رکھے۔“

تخریج الحدیث:

یہ روایت مندرجہ ذیل کتب میں موجود ہے۔

[مسند احمد: 308/3، 319/3، السنن الکبری للبیہقی: 292/4، المعجم الاوسط: 3192، 4642، 8979، شعب الایمان: 3459، شرح مشکل الآثار: 2350]

چوتھی حدیث: حدیث ابن عباس وجابر رضی اللہ عنہما

سیدنا ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”من صام رمضان فأتبعه ستا من شوال صام السنة كلها“

ترجمہ: ”جس نے رمضان کے روزوں کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے، گویا کہ اس نے پورے سال کے روزے رکھے۔“

تخریج الحدیث:

یہ روایت المعجم الاوسط (4642) میں ہے۔

پانچویں حدیث: حدیث ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”من صام رمضان وا تبعه بست من شوال فذلك صيام الدهر“

ترجمہ: ”جس نے رمضان کے روزوں کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے، گویا کہ اس نے پورے زمانے کے روزے رکھے۔“

تخریج الحدیث:

[المعجم الاوسط : 7607، مستخرج ابی عوانة : 2702]

چھٹی حدیث: حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”من صام ستة ا يام بعد الفطر فكا نما صام الدهر كله“ [المجالس العشرة الامالی للحسن الخلال 67 الشاملة ، ذيل تاريخ بغدادلابن النجار: 29/1 طبعة مكتبة الأيمان المدينة المنورة ترجمه: عبد الملك بن حبيب، أبو القاسم البزاز الحنبلي]

ترجمہ: ”جس نے عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے گویا کہ اس نے پورے زمانے کے روزے رکھے۔“

ساتویں حدیث: غنام بن اوس رضی اللہ عنہ

غنام بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من صام ستا بعد يوم الفطر فكا نما صام الدهر ا و قال السنة"

ترجمہ: "جس نے عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے گویا کہ اس نے پورے زمانے کے روزے رکھے۔ یا فرمایا: سال کے روزے رکھے۔"

تخریج الحدیث:

یہ روایت مندرجہ ذیل کتب میں موجود ہے۔

[معرفة الصحابة لابي نعيم :5981،(باب الميم ،مالك بن التيهان ا بو الهيثم الا نصاري) تاريخ كبير :206/5]

آٹھویں حدیث: مرسل طاؤس رحمہ اللہ

سیدنا طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" من صام رمضان وا تبعه بستة ا يام من شوال كتب له صيام سنة"

ترجمہ: "جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے اس کے نامہ اعمال میں پورے سال کے روزے لکھ دیئے جاتے ہیں۔"

تخریج:

[مصنف عبدالرزاق: 7920،كتاب الصيام ،باب صوم ستة التى بعد رمضان]

احناف کے یہاں مرسل روایت حجت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

احناف کے امام سرخسی الحنفی نے کہا کہ "دوسرے اور تیسرے قرن کی مرسل روایت ہمارے علماء کے قول کے مطابق حجت اور دلیل ہے"[1]

مولانا ظفر علی تھانوی (دیوبندی) صاحب لکھتے ہیں: "اور ہمارے نزدیک مرسل روایت حجت ہے۔"[2]

---

[1] الاصول للسرخسي 360/1

[2] اعلاء السنن 82/1،بحث المرسل

اللہ کی توفیق سے ہم نے اس باب میں موجود آٹھ احادیث کو ذکر کیا ہے۔ جو کہ اس فضیلت والے عمل کی اہمیت اور مہتم بالشان ہونے کو واضح کر دیتی ہیں۔ اس حوالے سے بعض اہل علم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت کا بھی اشارہ کیا ہے، جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے۔ اور بعض شارحین نے اس روایت کی نسبت امام طبرانی کی طرف کی ہے۔ اسی طرح اس باب میں بعض نے کہا ہے کہ انس سے بھی مروی روایت ہے۔ بہر حال اب ہم اس حوالے سے مفتی زرولی صاحب کے اعتراضات کی حقیقت اور ضعف کو واضح کئے دیتے ہیں۔

اعتراضات کا جائزہ

مفتی زرولی صاحب نے جو اپنے کتابچے بنام ''احسن المقال فی کراھیة صیام ستة شوال'' میں چند اعتراضات وشبہات وارد کئے ہیں جو سراسر دھوکہ دہی پر مشتمل ہیں، ان کا جواب پیش خدمت ہے۔

اعتراض:

موصوف نے حدیثِ ابی ایوب رضی اللہ عنہ پر کچھ اعتراض کئے ہیں، جن میں سے **پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس کی سند میں سعد بن سعید متکلم فیہ اور ضعیف ہے۔**[1]

جواب:

اولاً: سعد بن سعید جمہور کے نزدیک ثقہ ہیں۔ دیکھئے استاد محترم رحمہ اللہ کا مضمون۔[2]

ثانیاً: ان کے بارے میں مدار الحدیث ہونے کا دعوی غلط ہے۔ ان کی تین ثقہ راویوں سے متابعت ثابت ہے۔ جن کے نام یہ ہیں: صفوان بن سلیم[3]، زید بن اسلم[4]، یحی بن سعید بن قیس[5]۔

---

[1] احسن المقال: 26

[2] مقالات: 2/ 324، 325

[3] مسند حمیدی: 380

[4] شرح مشکل الآثار: 2343، باب بیان مشکل ما روي عن رسول الله ﷺ من قوله من صام رمضان ثم أتبعه ستا من شوال فكأنما صام السنة

[5] مسند حمیدی: 382

ثالثاً: امام مسلم، ابن حبان، ابن خزیمہ، امام ترمذی رحمھم اللہ اور دیگر سے اس روایت کو صحیح قرار دینا ثابت ہے۔

اعتراض :

مفتی صاحب لکھتے ہیں: ''**امام ترمذی نے بھی مدار الحدیث سعد بن سعید پر کلام کیا ہے**۔ چناچہ ملاحظہ ہو۔

و سعد ابن سعید هو! اخو یحیي بن سعید الانصاری، و قد تکلم بعض اهل الحدیث فی سعد بن سعید من قبل حفظه ''[1]

جواب:

اولاً: امام ترمذی رحمہ اللہ نے ہی اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے جو کہ اکثر نسخوں میں ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا حسن کہنا آپ کو بھی مسلّم ہے۔ جس کا واضح معنی یہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے پیش نظر دیگر طرق بھی ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کر دیا گیا ہے۔

ثانیاً: اس روایت کا مدار السند سعد بن سعید کو کہنا قطعاً صحیح نہیں۔ کیونکہ ان کی مزید تین ثقہ راویوں نے متابعت کر رکھی ہے۔ کما مرّ۔

اعتراض:

موصوف شرح مشکل الآثار کے حوالے سے لکھتے ہیں: **''ابوجعفر الطحاوی رحمہ اللہ نے سعد بن سعید کی وجہ سے صحت حدیث کا انکار کیا ہے اور فرمایا کہ محدثین بھی اس کی وجہ سے اس حدیث سے اعراض کر چکے ہیں۔''**[2]

جواب: مفتی صاحب نے یہاں بڑی بددیانتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیونکہ ابوجعفر الطحاوی رحمہ اللہ نے مزید طرق کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اور پھر حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی نقل کیں۔ اور مفتی صاحب نے یہ بددیانتی نادانستہ نہیں کی بلکہ قصداً کی ہے۔ جیسا کہ ان کی اگلی ہی عبارت اس کی چغلی کھا رہی ہے۔ لکھتے ہیں: ''آگے کچھ طرق کے بارے میں امام ابوجعفر طحاوی رحمہ اللہ نے کچھ اظہار رائے فرمایا ہے۔ مگر ان تمام روایات میں یا تو عمرو بن ثابت ہے جسے امام مالک نے منکر اور غیر ثقہ اور ناقابل اعتماد

---

[1] احسن المقال : 27،

[2] احسن المقال :27

کہا ہے۔۔۔"[1]

اندازہ لگائیں وہی امام طحاوی رحمہ اللہ جب سعد بن سعید پر جرح کریں تو قبول اور وہی امام طحاوی رحمہ اللہ دیگر طرق کی طرف اشارہ کر کے گویا حدیث کو صحیح ثابت کر رہے ہیں تو وہ مردود۔ اچھی وفا نبھائی ہے آپ نے !!

صحیح مسلم پر مقلدانہ حملہ:

اعتراض: (چونکہ حدیث ابی ایوب رضی اللہ عنہ صحیح مسلم میں موجود ہے، جس کی صحت کو امت نے تسلیم کیا ہے۔) مگر موصوف اپنے مؤقف کے دفاع کے لئے صحیح مسلم پر حملہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال الحاکم و کتاب مسلم ملآن من الشیعة[2]

جواب:

مفتی صاحب نے دراصل یہاں بڑے غیر محسوس انداز میں صحیح مسلم کی صحت پر حملہ کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں صحیح مسلم کی صحت پر حملہ کر کے موصوف نے منکرین حدیث کی ہی ترجمانی کی ہے۔

دھوکہ:

مفتی صاحب نے جو قول امام حاکم رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، دراصل یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے صحیح ترین ہونے کو مانتے تھے اس کی سب سے بڑی دلیل امام حاکم رحمہ اللہ کی کتاب جس کا نام انہوں نے المستدرک علی الصحیحین رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کتاب میں موجود روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجے کی نہیں اور نہ ہی ان کی طرح اسے امت کے ہاں قبولیت حاصل ہے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ ان دونوں کتابوں کو صحیح مانتے تھے۔ اور دل میں اس حد تک ان کی حیثیت تھی کہ اپنی بساط کے مطابق اسی طرز پر المستدرک لکھنے کی کوشش کی۔ اور نام میں ہی الصحیحین لکھ کر بتا دیا کہ ان کے نزدیک یہ دونوں کتابیں صحیح ہیں۔ اتنی بڑی اس منہ بولتی حقیقت کے باوجود اس مقام پر ان کا یہ قول پیش کرنا!! نرا دھوکہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ کے المستدرک علی الصحیحین لکھنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ

---

[1] احسن المقال :27

[2] احسن المقال :27

کر سکتے ہیں کہ یہاں امام حاکم رحمہ اللہ کی لفظ شیعہ سے مراد وہ راوی ہیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیگر صحابہ پر فوقیت دیتے ہیں۔اور ثقاہت ، دیانت اور عقائد میں وہ صحیح ہیں۔لہذا مفتی صاحب کا یہ قول پیش کرنا نرا دھوکہ ہے۔

دوسرا دھوکہ یا :

موصوف کا دوسرا دھوکہ یہ ہے کہ انہوں نے تدریب الراوی کا حوالہ دیا ہے اور تدریب الراوی ہی میں شیعہ راویوں کے حوالے سے امام سیوطی اور امام ذہبی رحمہما اللہ کا کلام چند ہی صفحات کے بعد ہے۔(یہ دونوں قول آگے آرہے ہیں۔) جس کی موجودگی میں امام حاکم رحمہ اللہ کے اس مذکورہ بالا قول کو ذکر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

تین نکاتی جواب:

موصوف کے ان دو دھوکوں کے ذکر کے بعد طوالت سے بچتے ہوئے ہم مفتی صاحب کی صحیح مسلم کی اس ہرزہ سرائی کا تین نکات میں جواب دیتے ہیں۔

ا۔صحیح مسلم کو امت کی تلقی بالقبول حاصل ہے۔اس حوالے سے کئی ایک اہل علم کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں،ہم چند ایک پر اکتفاء کرتے ہیں:

امام نووی رحمہ اللہ :''اتفق العلماء رحمهم الله على أن أصح الكتب بعد القرآن العزيز الصحيحان البخاري و مسلم و تلقتهما الامة بالقبول ''[1]

یعنی: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ'' الخبر المحتف بالقرائن '' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:'' و الخبر المحتف بالقرائن أنواع:منها ما أخرجه الشيخان فی صحیحیهما مما لم يبلغ حد المتواتر فانه احتف به قرائن منها: جلالتهما فی هذا الشأن۔و تقديمهما فی تمييز الصحيح على غيرهما۔و تلقى العلماء لكتابيهما بالقبول۔''[2]

---

[1] شرح النووی:128/1،مقدمة،فصل اصح الكتب بعد القرآن الصحيحان

[2] شرح نخبة الفكر : 38،37 طبع الميزان

یعنی: ''ایسی حدیث جسے کئی قرائن نے گھیرا ہوا ہو۔اس کی کئی اقسام ہیں۔ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ جسے امام بخاری اور امام مسلم رحمھما اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہو اور وہ روایت حد تواتر کو نہ پہنچے۔ایسی روایت کو کئی قرائن نے گھیرا ہوا ہے، امام بخاری اور امام مسلم رحمھما اللہ کی فن حدیث میں جلالت شان، صحیح اور ضعیف احادیث کے مابین فرق کرنے میں سب سے مقدم ہیں، اور ان کی کتابوں کو امت نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے۔''

امام ابوعبداللہ الحمیدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''لم نجد من الأئمة الماضين من أفصح لنا فی جميع ما جمعه با الصحة الا هذين الامامين''[1]

یعنی: امام بخاری اور امام مسلم رحمھما اللہ کے علاوہ ائمہ سلف میں سے ہم کسی کو نہیں پاتے کہ جس نے یہ کہا ہو کہ ہم نے جو کچھ بھی ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے۔

امام ابن الصلاح رحمہ اللہ نے مستقل کتاب صیانۃ صحیح مسلم لکھی۔اور اہل علم کا اس میں اس کی صحت پر اجماع نقل کیا۔

امام نووی رحمہ اللہ نے امام جوینی کا ایک فتوی بھی نقل کیا ہے کہ

''لو حلف انسان بطلاق امرأته أن مافی کتابی البخاری و مسلم مما حكما بصحته من قول النبی صلی الله عليه وسلم لما ألزمته الطلاق و لا حنثته لاجماع المسلمين علی صحتهما۔''[2]

یعنی: اگر کوئی شخص یہ قسم اٹھالیتا ہے کہ اگر صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نبی ﷺ کی جو بھی حدیث ہے وہ صحیح نہ ہو تو میری بیوی کو طلاق ہو۔تو یہ طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ مسلمانوں کا ان دونوں کی صحت پر اجماع ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ: أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون علی أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع و أنهما متواتران الی مصنفيهما و أنه كل من يهون أمرهما فهو

---

[1] مقدمة ابن الصلاح

[2] شرح النووی: 136/1، مقدمة، فصل فی حكم احاديث صحيح مسلم

مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين۔[1]
یعنی: صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود روایت کے بارے میں محدثین کا اتفاق ہے کہ وہ قطعی طور پر صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک متواتر ہیں۔ اور جو صحیح بخاری و صحیح مسلم کو یہ حیثیت نہیں دیتا وہ بدعتی ہے اور مسلمانوں کے علاوہ دوسروں کی راہ پر گامزن ہے۔
ہم مفتی صاحب کو مشورہ دیں گے کہ یہ قول بار بار پڑھیں تا کہ انہیں احساس ہو کہ وہ کس ڈگر پر چل رہے ہیں۔

۲۔ خود حنفیہ نے صحیح مسلم کی صحت کو قبول کیا ہے۔ مثلاً
علامہ عینی لکھتے ہیں:
”اتفق علماء الشرق والغرب على أنه ليس بعد كتاب الله تعالى أصح من صحيحي البخاري ومسلم“[2]
یعنی: مشرق و مغرب کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کی کتاب قرآن مجید کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔
ملا علی قاری صاحبِ مشکوۃ کے مقدمے کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
” اتفقت العلماء على تلقي الصحيحين بالقبول“[3]
یعنی: علماء صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو قبول کرنے میں متفق ہیں۔
انور شاہ کشمیری کتب ستۃ پر لفظ صحاح کے استعمال کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کتب ستۃ پر صحاح کا اطلاق تغلیباً ہے، ورنہ صحیح تو صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں اور باقی سنن ہیں۔[4]
اسی طرح سرفراز صفدر نے بھی اس کی صحت پر امت کے اجماع کا اقرار کیا۔[5]

۳۔ تشیع کا استعمال دو قسم کے افراد پر ہوا ہے۔ (1) جن کے عقائد شرکیہ و کفریہ ہیں۔ (2) وہ

---

[1] حجة الله البالغة
[2] عمدة القاری
[3] مرقاة المفاتيح: 62/1
[4] العرف الشذی
[5] احسن الكلام: 249/1 طبع سوم

لوگ جو عقیدے میں تو صحیح تھے صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو باقی صحابہ پر فضیلت دیتے تھے۔ ایسے راویوں پر بھی اس کا متقدمین نے اطلاق کیا ہے۔ جیسا کہ تدریب الراوی ہی کو لے لیں! (جس کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے، مگر افسوس علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جو تشیع سے مراد ذکر کی ہے وہ ان کو نظر ہی نہیں آئی) علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے صحیحین میں وہ راوی جن پر تشیع کا الزام ہے ان کے نام ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ھؤلاء رموا بالتشیع وھو تقدیم علي علی الصحابة''[1] یہ راوی جن پر تشیع کا الزام ہے۔ وہ یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دینا۔

اسی طرح امام ذہبی رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''امام ذہبی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں،

(1) چھوٹی بدعت جیسے تشیع غلو کے ساتھ ہو یا بغیر غلو کے۔ جیسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال کرنے والوں کے بارے میں کلام کرنے والا تابعین و تبع تابعین میں ایسے راوی (باوجود ان کے دین، ورع اور صدق کے) موجود ہیں۔ اگر ان کی روایت کو رد کر دیا جائے تو نبی ﷺ کی احادیث کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جائے۔

(2) بدعت کبری جیسے کامل رفض، اور اس میں غلو۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر طعن کرنا ایسے راوی کی روایت حجت نہیں۔[2]

نیز یہ بات خود حنفیہ نے بھی لکھی، مثلاً سرفراز صفدر صاحب لکھتے ہیں: ''شیعہ ہونا بغیر داعیہ کے اصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں''[3]

نیز لکھتے ہیں: ''متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح لفظ شیعہ کے بارے میں جدا جدا ہے۔ حضرات متقدمین کے نزدیک شیعہ کا اور مفہوم ہے اور حضرات متاخرین کے نزدیک اور ہے۔''[4]

---

[1] تدریب الراوی: 389/1

[2] تدریب الراوی: 386/1

[3] تسکین الصدور: 110، اتمام البرھان: 41/3، نور و بشر: 72، بحوالہ سرفراز صفدر اپنی تصانیف کے آئینے میں

[4] ارشاد الشیعہ: 19 بحوالہ سرفراز صفدر اپنی تصانیف کے آئینے میں

ان تینوں نکات پر ہماری گفتگو سے صحیح مسلم کا مقام واضح ہو چکا ہے اور ساتھ ہی صحیحین کے بارے میں مفتی صاحب کا دلی بغض بھی واضح ہوگیا۔

اعتراض: عمر بن ثابت پر کلام کے بارے میں استذکار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"و اظن الشیخ عمر بن ثابت لم یکن عندہ ممن یعتمد علیه۔"[1]

جواب: خیانت کی حد ہوتی ہے جن کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ خود عمر بن ثابت کو ثقہ قرار دے رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں: عمر بن ثابت الأنصاري وهو من ثقات أهل المدينة[2] یعنی عمر بن ثابت مدینہ کے ثقہ لوگوں میں سے ہیں۔

اب اندازہ لگائیں کہ الاستذکار میں تو ان کی توثیق کو ثابت کیا جا رہا ہے، مگر مفتی صاحب اسی کتاب کے حوالے سے عمر بن ثابت پر جرح کر رہے ہیں۔

ثانیاً: صاحب استذکار نے یہ بھی لکھا ہے کہ حدیث ثوبان رضی اللہ عنہ عمر بن ثابت کی روایت کو قوی کرتی ہے۔[3]

ثالثاً: یہی صاحب استذکار علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ بڑے واشگاف الفاظ میں شوال کے ان چھ روزوں کی فضیلت بھی بیان کرتے ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ کے قول کی توجیہ بھی کرتے ہیں۔لیکن مفتی صاحب یہاں آکر ان سے اختلاف کر جاتے ہیں۔

جہاں تک عمر بن ثابت کی توثیق کا معاملہ ہے تو وہ پہلے ہی حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ بیان کر چکے ہیں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں: "حافظ ابن حبان نے آپ کو کتاب الثقات (149/5) میں ذکر کیا امام عجلی نے کہا: مدنی تابعی ثقہ (تاریخ العجلی: 1333) ابن شاہین نے انہیں کتاب اسماء الثقات (693) میں ذکر کیا امام مسلم، امام ترمذی، امام ابن خزیمہ، حافظ ابوعوانہ اور حافظ بغوی نے ان کی حدیث کو صحیح قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔حافظ ابن حجر نے کہا: ثقہ ہے (تقریب التہذیب: 4780)"[4]

اعتراض:

استذکار کے حوالے سے لکھتے ہیں: اس روایت کے موقوف و مرفوع ہونے کا اضطراب بھی موجود ہے۔[5]

جواب: یہ بھی بہت بڑا دھوکہ ہے، صاحب استذکار کی عبارت یہ ہے:

"هكذا ذكره موقوفا على أبي أيوب وقد روي عن يحيى بن سعيد عن عمر بن

---

[1] احسن المقال: 55، [2] الاستذکار: 3/368، [3] مسند حمیدی: 380، [4] مقالات: 2/323، [5] احسن المقال: 55

ثابت بإسناده مثله موقوفا "[1]

یعنی: یہ روایت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے، یحییٰ بن سعید نے اسے عمر بن ثابت سے اسی سند کے ساتھ موقوف بیان کیا ہے۔

درحقیت صاحب استذکار نے اس روایت کے موقوف اور مرفوع ہونے کا تو ذکر کیا ہے، لیکن یہ نہیں کہا کہ یہ اضطراب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ یہ بیان کررہے ہیں کہ یہ روایت مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح ثابت ہے۔ مگر مفتی صاحب نے صاحب استذکار پر بہت بڑا بہتان باندھتے ہوئے استذکار کا حوالہ دے کر گویا یہ ثابت کیا کہ انہوں نے اس حدیث کا مضطرب ہونا ثابت کیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

ثانیاً: اگر اسے مضطرب مان بھی لیا جائے تو ترجیح بھی ممکن ہے یعنی عمر بن ثابت سے اس روایت کو چار شاگردوں نے مرفوعاً بیان کیا ہے اور ایک نے موقوف۔ اب میرا مفتی صاحب سے سوال ہے کہ اگر انہوں نے اصول حدیث پڑھے ہیں تو اب ایک طرف چار راوی جو مرفوع بیان کررہے ہیں اور ایک طرف ایک! کیا چار کی بات راجح نہیں؟! واضح سی بات ہے کہ چار راویوں کی روایت کا مرفوع ہونا راجح ہے پھر مزید یہ کہ دیگر مرفوع شواہد بھی موجود ہوں تو پھر تو اس کا مرفوع ہونا اور زیادہ قوی ہوجاتا ہے۔

اعتراض: موصوف فتوحات مکیہ کے حوالے سے روایت کے متن کو منکر کہتے ہیں۔[2]

جواب:

اولاً: جمہور اہل علم کے مقابلے میں ابن عربی کی بات کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور اہل علم میں سے کسی نے بھی اس حدیث کو منکر قرار نہیں دیا۔

ثانیاً: اس روایت کے متن کو منکر قرار دینے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ایام سارے مذکر ہوتے ہیں لہذا اس حدیث میں ستتًا کا لفظ آیا ہے جبکہ ستة آنا چاہئے۔ لہذا یہ حدیث متناً منکر ہے۔

جواب: امام نووی رحمہ اللہ نے اس اشکال کا جواب دیا ہے۔ کہ عدد کا معدود جب محذوف ہو تو ایسا جائز

---

[1] الاستذکار: 3/368

[2] احسن المقال: 46، 55

ہے۔امام نووی رحمہ اللہ نے اہل لغت کے حوالے سے بھی اس کی مثال دی ہے۔اور دیگر شارحین نے بھی۔

لہذا اس بنیاد پر حدیث کے متن کو منکر قرار دینا عجیب سے عجیب تر ہے۔

مفتی زرولی کے عذر لنگ:

موصوف حدیث کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''واضح رہے کہ ثواب کے لئے ہمیشہ ایسے اعمال اور اجور ذکر کئے جاتے ہیں جو شرعاً محمود ہیں جیسے جامع ترمذی میں ہے کہ جس نے فجر کی نماز جماعت سے پڑھی پھر بیٹھ کر ذکر کرتا رہا یہاں تک کہ سورج نکلا اور اس نے دو رکعت پڑھیں تو اس کو حج اور عمرہ کا ثواب ملے گا۔ حج وعمرہ باعث اجر افعال ہیں۔اس لئے وہ ثواب میں ذکر کئے گئے۔''[1]

پھر لکھتے ہیں: ''یا دوسری روایت جو معروف عند اصحاب السنن ہے کما فی البخاری کہ سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھنے سے ایک قرآن کا ثواب ملتا ہے۔تو چونکہ قرآن کریم پورا کرنا باعث اجر عظیم ہے اس لئے بطور ثواب کے ذکر کیا گیا۔''[2]

جواب:

ہمارے نزدیک مفتی صاحب کی یہ دونوں باتیں عذر لنگ سے کم نہیں۔موصوف کا پہلا قاعدہ ثواب کے لئے ہمیشہ ایسے اعمال اور اجور ذکر کئے جاتے ہیں جو شرعاً محمود ہیں۔مفتی صاحب کے اس قاعدے کی رو سے کتنے فضائل اور اعمال پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے؟ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

پانچ نمازیں، اجر میں پچاس کے برابر!![3] کیا پچاس نمازیں فرض پڑھنا شرعاً محمود ہیں؟؟

مؤذن قیامت کے دن لمبے قد والے ہوں گے۔[4] کیا لمبا قد یا لمبی گردن شرعاً محمود ہے؟

حدیث میں ہے: جو عشاء اور فجر کی فضیلت جان لے تو اسے اگر گھٹنے کے بل چل کر آنا پڑے تو وہ

---

[1] احسن المقال : 28

[2] احسن المقال: 28

[3] صحيح بخاری: کتاب الصلوة ،باب كيف فرضت الصلوة ،صحيح مسلم: كتاب الايمان،باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السماوات وفرض الصلوات

[4] صحيح مسلم : كتاب الصلوة ،باب فضل الاذان

آئے۔[1]

حالانکہ سکینت اور وقار کے ساتھ آنے کا حکم ہے۔[2] اس روایت کے مقابلے میں کیا گھٹنے کے بل آنا شرعاً محمود ہے؟؟

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ قرآن کی تعلیم تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔[3] اب کیا سرخ اونٹ رکھنا شرعاً محمود ہیں؟

اس حوالے سے مزید مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں، فی الحال انہیں پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

شوال کے چھ روزے اور صوم الدھر کے مفہوم کی وضاحت:

اعتراض: ان روزوں کے لئے صوم الدھر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے مفتی صاحب نے اس کی کراھیت کا استدلال کیا ہے۔[4]

جواب:

اولاً: قاعدہ ''الحدیث یفسر بعضه بعضاً ''یعنی ایک حدیث دوسری حدیث کی وضاحت کرتی ہے۔ اگر ایک روایت میں ''الدھر '' کے الفاظ ہیں تو دوسری میں ''السنة '' کے الفاظ بھی ہیں۔ جس سے مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

ثانیاً: صوم الدھر کو اصل معنی میں رکھا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ جب حدیث ثابت ہوجائے تو ہمارا کام ماننا ہے نہ کہ فرار کی راہیں ڈھونڈنا۔

---

[1] صحیح بخاری:کتاب الاذان، باب الاستھام فی الاذان ،صحیح مسلم :کتاب الصلوة باب تسویة الصفوف

[2] صحیح بخاری: کتاب الاذان باب لا یسعی إلی الصلاة ولیأت بالسکینة والوقارصحیح مسلم:کتاب المساجد و مواضع الصلوة ،باب استحباب اتیان الصلوة بوقار و سکینة والنھی عن اتیانھا سعیاً

[3] صحیح بخاری:کتاب الجھاد والسیرباب دعاء النبي صلی الله علیه وسلم الناس إلی الإسلام والنبوة وأن لا یتخذ بعضھم بعضا أربابا من دون الله ،صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة رضي الله تعالی عنھم، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه

[4] احسن المقال:28، 29

ثالثاً: اگر الدھر کا لفظ مفتی صاحب پر اتنا ثقیل گزر رہا ہے کہ اس کی بنیاد پر اصل حدیث کا ہی انکار کردیں۔تو پھر اس مفہوم کا اجر دیگر روزوں اور عبادات کے لئے بھی ثابت ہے۔مثلاً

تین روزوں ایام بیض کی فضیلت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

[من صام ثلاثة ا يام من كل شهر فذلك صوم الدهر فا نزل الله عز وجل تصديق ذلك في كتابه:﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾(الانعام:160)فاليوم بعشرة ايام][1]

ترجمہ: جس نے ہر مہینے تین روزے رکھے (ایام بیض کے) یہ پورے سال کے روزے کے برابر ہے۔اس کی تصدیق اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں نازل کی ہے۔کہ جس نے ایک نیکی کی اسے اس کے مثل دس نیکیوں کا اجر ملے گا۔تو گویا کہ ایک دن دس دن کے برابر ہوا۔

نیز یہ اللہ کی طرف سے خصوصی عنایت ہے کہ اللہ تعالی نے جو بھی چیز تخفیفاً مسلمانوں سے ہٹائی، اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی۔مثلاً پہلے پچاس نمازیں فرض تھیں، پھر پانچ نمازیں ہوئیں۔اور پانچ نمازوں کی فرضیت کے وقت کہا گیا کہ نمازیں پانچ ہیں اور اجر پچاس کا ہی ملے گا۔تو یہ اللہ تعالی کی خصوصی عنایت ہے۔

اسی طرح اگر ایک شخص بغیر کسی ناغے کے اور بغیر سوئے مسلسل سال بھر کی راتوں کا قیام کرتا ہے۔تو اس کا یہ عمل شریعت میں مستحسن نہیں، جیسا کہ اس میں تین صحابہ والے واقعے سے اس کی نفی پر نص موجود ہے۔لیکن اللہ تعالی نے اجر کا سلسلہ ایسا رکھا کہ ایک رات (لیلۃ القدر) جسے ہزار راتوں کی عبادت سے افضل قرار دے دیا۔جبکہ ہزار راتوں کا قیام مسلسل بغیر ناغے کے کرنا مستحسن نہیں۔

جو لوگ صیام الدھر کی منع کے ذریعے سے استدلال کر کے ان روزوں کو ممنوع قرار دیتے ہیں، ایسے لوگ نادانی کی انتہاء کو پہنچے نظر آتے ہیں، اس لئے کہ ان کے اس فلسفے کی وجہ سے حج مبرور کے ثواب، پانچ نمازوں کے ثواب اور ایام بیض کے رزوں کے اجر وغیرہ سب پر سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے؟ اور سب کو اگر اسی عینک سے دیکھا جائے تو سب مکروہ نظر آتے ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجة :1708 ،كتاب الصيام ،باب ما جاء في صيام ثلاثة أيام من كل شهر

امام مالک رحمہ اللہ اور شوال کے چھ روزے:

اعتراض: امام مالک رحمہ اللہ سے مؤطا میں صراحتاً ان روزوں کا انکار اور اس کے ارتکاب کو بدعت فرمانا منقول ہے۔[1]

اولاً: آپ کا امام مالک رحمہ اللہ کا قول اور ان کا مؤقف پیش کرنا کسی عجوبے سے کم نہیں کیونکہ ایک طرف تو آپ کا زور اس بات پر ہے کہ فتوی اصل امام کے فتوی پر ہی ہوگا۔

ثانیاً: امام مالک رحمہ اللہ کے اپنے قول [إنما أنا بشر أخطئ وأصيب فانظروا في رأيي فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذوه وكل مالم يوافق الكتاب والسنة فاتركوه][2] یعنی: میں انسان ہوں کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے اور کبھی میرا مؤقف صحیح بھی ہوتا ہے۔ پس میری رائے میں سے جو کتاب وسنت کے مطابق ہو اسے لے لو۔ اور جو خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔ اس قول کی وجہ سے امام مالک کا شوال کے روزوں سے متعلق مذکورہ قول حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں مردود ہے۔

ثالثاً: امام مالک رحمہ اللہ کے اس قول کی وضاحت مختلف اہل علم نے نقل کی ہے، مالکیہ نے اس قول کی جو وضاحت کی ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم سنت کو سینے سے لگایا ہے اور امام مالک کے قول کی ایسی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا قول حدیث کے بالکل مقابل آ کر کھڑا نہ ہو جائے۔ ان کا یہ عمل قابل تحسین ہے، جنہوں نے تقلیدی جمود کی ایسی کالی پٹی نہیں پہنی کہ انکار یا تاویل کرتے وقت وہ بھول ہی جائیں کہ ہم یہ جرأت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے بارے میں کر رہے ہیں۔ آیئے ملاحظہ کیجئے کہ مالکیہ سمیت دیگر اہل علم نے اس قول کی کیا وضاحت کی ہے۔

امام زرقانی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت میں مطرف کا قول نقل کیا ہے: ''امام مالک رحمہ اللہ نے صرف اس ڈر سے کہ جہلاء اسے رمضان کے ساتھ نہ ملا دیں، ناپسند سمجھا۔ البتہ اس بارے میں وارد احادیث سے جو فضیلت ملتی ہے اس بنا پر کوئی روزہ رکھتا ہے تو یہ مستحسن ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں''۔

پھر فرماتے ہیں: ''قال شيوخنا إنما كره مالك صومها مخافة ان يلحق الجهلة برمضان غيره.''[3]

---

[1] أحسن المقال: 24 [2] جامع بيان العلم: 777/1 [3] شرح الزرقاني: 2/245

یعنی: ''ہمارے شیوخ کے نزدیک امام مالک رحمہ اللہ کا ان روزوں کو مکروہ سمجھنا اس ڈر سے تھا کہ کہیں جاہل لوگ اسے رمضان کے ساتھ نہ ملادیں''۔

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی استذکار میں ان کے اس قول کی وضاحت یہی کی ہے کہ یا تو امام مالک نے اس ڈر سے کہ جہلاء اسے رمضان کے ساتھ نہ ملادیں۔ یا امام مالک رحمہ اللہ تک یہ حدیث ہی نہیں پہنچی۔

نیز اہل علم میں سے بڑی تعداد نے امام مالک رحمہ اللہ کے اس قول کی یا توجیہ کی یا یہی سمجھا کہ امام مالک رحمہ اللہ تک حدیث نہ پہنچ سکی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مقابلے میں اس قول کو مردود سمجھا۔ چند ایک اہل علم کے نام ملاحظہ فرمائیں:

امام نووی[1]، ابن رشد[2]، ابن عبدالبر[3]، امام زرقانی[4]، امام سندی[5] ملا علی قاری[6] انور شاہ کشمیری[7]، امام طیبی[8]، امام صنعانی[9]، ابومحمد موفق الدین عبداللہ ابن قدامۃ[10] ابوالفرج شمس الدین عبدالرحمن بن محمد ابن القدامۃ[11] یحی کاندھلوی[12] قاضی حسین محمد المغربی[13] ابن البناء[14] امام شوکانی[15]، عبیدالرحمٰن مبارکپوری[16]، عبدالرحمٰن مبارکپوری[17]، شمس الحق عظیم آبادی[18] رحمہم اللہ تعالی اجمعین اور دیگر کئی ایک اہل علم نے اس قول کی توجیہ کی یا پھر کھلے انداز میں حدیث کو ہی ترجیح دی۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے کہ حدیث کو ترجیح دی جائے اس لئے کہ خود امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے جیسا کہ گزرا کہ اگر میری بات حدیث کے موافق ہو تو لے لو اور اگر مخالف ہو تو اسے چھوڑ دو۔ لہٰذا ہمیں ان کے بارے میں یہی حسن ظن ہے کہ ان تک یہ حدیث ہی نہیں پہنچی ہوگی۔

اور مفتی صاحب کو عجیب کشمکش کا سامنا ہے کہیں وہ لکھتے ہیں: ''یہ کہنا قواعد علم کے خلاف ہے کہ مؤطا یا امام مالک کے ہم مقلد نہیں ہیں۔ اولاً یہ دین کا مسئلہ ہے اور ثانیاً ہمارے امام سے بھی کراہت منقول

---

[1] شرح النووی: 8/44، شرح المھذب: 6/378، [2] بدایۃ المجتھد: 225/1، [3] الاستذکار: 9/368، [4] شرح الزرقانی: 45 2/2، [5] شروح سنن ابن ماجۃ: 679/1، [6] المرقاۃ: 476/4، [7] عرف الشذی، [8] شرح الطیبی: 220/4، [9] سبل السلام: 340/2، [10] المغنی: 112/3، [11] شرح الکبیر: 97/3، [12] الکوکب الدری علی جامع ترمذی: 61/2، [13] البدرالتمام شرح بلوغ المرام: 452/2، [14] فتح الربانی: 1567/2، [15] نیل الاوطار: 4/ 243، [16] مرعاۃ المفاتیح: 7/ 64، [17] تحفۃ الاحوذی: 388/3، [18] عون المعبود: 62/7،

ہے۔''[1] یعنی کہیں وہ کہتے ہیں کہ مؤطا پر عمل سے تقلید پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ دوسری طرف ان کا مؤقف یہ بھی ہے کہ فتوی مطلق امام کے قول پر ہوگا یہاں وفائے تقلید میں اس قدر خالص نظر آتے ہیں کہ مشائخ حنفیہ کی بھی بات قبول نہیں، جن کی کتابوں کے حوالے دے کر قول امام پیش کرتے ہیں۔

رابعاً: امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بدعت کہا ہے اور موصوف نے تو امام مالک رحمہ اللہ کے قول کو لیا ہی نہیں۔ اس لئے کہ موصوف لکھتے ہیں: ''ان کا ترک مناسب اور اولی ہے۔''[2] مفتی صاحب کے اس جملے سے جو مفہوم نکل رہا ہے وہ یہی ہے کہ روزہ رکھنے والے کے بارے میں موصوف نرم گوشہ رکھتے ہیں، جبکہ جو مؤقف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مفتی صاحب نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ روزے مکروہ ہیں۔ گویا کہ مفتی صاحب نے خود پوری طرح سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مؤقف لیا ہی نہیں۔

حدیث پر جرح اور اصل مقصد:

مفتی صاحب نے حقِ تقلید نبھاتے ہوئے حدیث پر جرح کی ہے۔ ہم بڑے وثوق سے کہہ رہے ہیں کہ مفتی صاحب کو یہاں حدیث سے کوئی سروکار نہیں اصل مقصد مذہب امام کا دفاع ہے۔ کیونکہ خود مفتی صاحب یہ لکھ چکے ہیں:

''صرف روایت میں آنا عمل کے لئے کافی نہیں ہے جب تک فقہاء کرام نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہو''[3]

یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو قابل عمل بنانے کے لئے فقہاء کا اس پر عمل ہونا ضروری ہے۔ یہ جرأت تو منکرین حدیث نے بھی نہیں کی تھی وہ تو بظاہر یہی کہتے ہیں کہ ہم وہی حدیث لیں گے کہ جو قرآن کے موافق ہو۔ لیکن مفتی صاحب تو انکار حدیث میں ان سے بھی کہیں آگے نکلے کہ حدیث پر عمل کے لئے موافق قرآن نہیں بلکہ فقہاء کے عمل کے موافق ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہماری دعوت یہ ہے کہ ہم نے کلمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پڑھا ہے، لہٰذا آپ کے مقابلے ساری دنیا کی بات کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ آپ کی بات کو کسی کے قول و عمل کی وجہ سے نہیں چھوڑا جا سکتا۔

---

[1] احسن المقال :38

[2] احسن المقال :65

[3] احسن المقال :36

اسی طرح ایک جگہ مفتی صاحب لکھتے ہیں: ''جبکہ مشائخ اوّل تو امام کے مقلد ہیں اور مجتہد کا قول مقلد کے لئے چھوڑنا قلب موضوع اور خروج عن المذھب کے مترادف ہے۔''[1]

اسی طرح ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''جو روایت قرن اول میں غیر معروف اور غیر معمول بہ ہو جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے صنیع اور صراحت سے معلوم ہوا۔ بعد میں اس پر ترک عمل بہتر ہے۔''[2]

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں: ''امام صاحب کی پیروی ضروری ہے۔''[3]

ان تمام عبارات سے واضح ہوا کہ دراصل یہاں حدیث پر طرح طرح کے طعن کرنے کا مقصد صرف تقلید کا دفاع ہے۔ اور اس دفاع کے لئے چاہے احادیث کے ساتھ جو بھی سلوک ہو اس کی انہیں کوئی پرواہ نہیں۔

شوال کے چھ روزے اور سلف صالحین:

شبہ:

موصوف لکھتے ہیں: ''شوال کا پہلا دن یعنی عید کا دن چھوڑ کر متفرق مہینے کے کسی حصے میں بھی یہ روزے رکھنا گو متاخرین حنفیہ کے قول کے مطابق مباح اور سنت حسنۃ مستحب ہو سکتے تھے مگر احادیث کے قرن اوّل میں متروک ہونے کی وجہ سے اور آئمہ کبار کے انکار اور اقوالِ مشائخ کے اضطراب کے نتیجہ میں اس کا ترک زیادہ بہتر اور باعث ثواب ہے۔''[4]

ازالہ:

اس عبارت میں موصوف کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ یہ احادیث قرن اوّل میں متروک تھیں۔ یہ احادیث قطعاً قرن اوّل میں متروک نہیں تھیں۔ بلکہ موجود، متداول اور معمول بہا تھیں۔

آیئے سلف میں یہ مسئلہ کتنا معروف، متداول تھا، ملاحظہ فرمائیں۔

اس حوالے سے عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول جامع ترمذی میں موجود ہے۔ ''ھو حسن ھو مثل صیام ثلاثة أیام من کل شھر''[5]

---

[1] احسن المقال : 37، [2] احسن المقال :65 [3] احسن المقال :38 [4] احسن المقال : 66

[5] جامع ترمذی مع التحفة :182/3

یعنی: ان روزوں کا رکھنا اچھا عمل ہے اور ایام بیض کے روزوں کی طرح ہیں۔

❁ امام بخاری رحمہ اللہ غنام بن اوس رضی اللہ عنہ والی روایت تاریخ کبیر میں لائے۔

❁ اس حوالے سے امام مسلم رحمہ اللہ اپنی صحیح میں حدیث (حدیث ابی ایوب) لائے۔ کما مرّ

❁ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں باب قائم کیا۔ ''باب في صوم ستة أيام من شوال''

❁ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع السنن میں باب قائم کیا۔
''باب ما جاء في صيام ستة أيام من شوال''

❁ امام نسائی رحمہ اللہ نے السنن الکبری میں باب قائم کیا: ''صيام ستة أيام من شوال''

❁ امام ابن ماجۃ رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں باب قائم کیا۔ ''باب صيام ستة أيام من شوال''

❁ امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں باب قائم کیا: ''باب في صيام الستة من شوال''

❁ امام احمد رحمہ اللہ اپنی مسند میں اس موضوع پر احادیث لائے۔

❁ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اپنی مصنف میں باب قائم کیا؛ ''باب صوم الستة التي بعد رمضان''

تنبیہ:

اس باب کے آخر میں امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے معمر رحمہ اللہ کا اور خود امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کا بھی ایک فتوی موجود ہے۔ یہ فتوی شوال کے چھ روزوں کی مطلق کراہت کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ عید سے متصل ابتدائی دنوں میں ان روزوں کی کراہت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔[1]

❁ امام ابن ابی شیبۃ رحمہ اللہ نے اپنی مصنف میں باب قائم کیا۔ ''ما قالوا في صيام ستة أيام من شوال بعد رمضان''

❁ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''لقد رضى الله عز و جل بهذا الشهر للسنة كلها''[2]

یعنی: اللہ تعالی اس مہینے (شوال کے چھ روزوں کا ثواب) سال کے برابر ہونے میں راضی ہو گیا ہے۔

❁ امام ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ اپنی مسند میں اس موضوع سے متعلق احادیث لائے۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق: 316/4

[2] جامع ترمذی مع التحفة : 182/3، مصنف ابن ابی شیبة :6/322

❁ امام ابویعلی الموصلی رحمہ اللہ اپنی مسند میں اس موضوع سے متعلق احادیث لائے۔

❁ امام حمیدی رحمہ اللہ اپنی مسند میں اس موضوع سے متعلق احادیث لائے۔

❁ امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنۃ میں باب قائم کیا۔ ''باب صوم ست من شوال''

❁ امام ابوعوانۃ رحمہ اللہ نے اپنی مستخرج میں باب قائم کیا۔ ''باب بیان ثواب من صام رمضان، وفضیلة صومه إذا أتبع بصوم ستة أيام من شوال''

❁ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا۔ ''ذكر كتابة الله صيام الدهر لمعقب رمضان بست من شوال''

❁ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا۔ ''باب فضل إتباع صيام رمضان بصيام ستة أيام من شوال، فيكون كصيام السنة كلها''

❁ ابونعیم رحمہ اللہ نے المسند المستخرج علی صحیح مسلم میں باب قائم کیا۔ ''باب في صيام الأيام الستة من شوال''

❁ امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم پر باب قائم کیا۔ ''باب استحباب صوم ستة أيام من شوال إتباعا لرمضان'' اسی طرح ریاض الصالحین میں باب قائم کیا: ''باب استحباب صوم ستة ايام من شوال''

❁ امام بیہقی رحمہ اللہ کی چھ کتابوں میں شوال کے چھ روزوں کی فضیلت واستحباب کو بیان کیا گیا ہے۔ السنن الکبری میں باب قائم کیا: ''باب في فضل صوم ستة أيام من شوال'' اور السنن الصغیر میں باب قائم کیا: ''باب صوم ستة أيام من شوال'' اسی طرح معرفۃ السنن والآثار میں باب قائم کیا: ''صوم ستة أيام من شوال'' فضائل الاوقات میں باب قائم کیا: ''باب فضل صوم شوال'' اور شعب الایمان میں باب قائم کیا: ''صوم ستة أيام من شوال'' اور خلافیات میں بھی اس کے استحباب کو بیان کیا۔

❁ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بھی اس کے استحباب کو بیان کیا، دیکھئے: اکمال المعلم للفوائد المسلم للقاضی عیاض

❁امام سندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث (حدیث ابی ایوب رضی اللہ عنہ) شوال کے چھ روزوں کے بارے میں واضح ہے۔حنفیہ میں سے اکثر متاخرین نے اسے لیا ہے۔''[1]

❁امام صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه دليل على استحباب صوم ستة ايام من شوال''[2]

یعنی: ''اس حدیث (حدیث ابی ایوب) میں شوال کے چھ روزوں کے مستحب ہونے کی دلیل موجود ہے۔''

❁پھر مزید ابن السبکی رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ثم قال ابن السبكي وقد اعتنى شيخنا ابو محمد الدمياطي بجمع طرقه فاسنده عن بضعة وعشرين رجلا رووه عن سعد بن سعيد واكثرهم حفاظ ثقات منهم السفيانان''[3]

یعنی: امام ابن السبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابو محمد الدمیاطی نے اس کے تمام طرق جمع کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے بیس سے زائد کو ذکر کیا جنہوں نے سعد بن سعید سے روایت کی ہے اور ان میں سے اکثر حفاظ،ثقات ہیں،ان میں سفیان بن عیینہ اور سفیان الثوری بھی ہیں۔

❁امام شوکانی رحمہ اللہ: ''استدل با حاديث الباب على استحباب صوم ستة ايام من شوال وإليه ذهب الشافعي واحمد وداود وغيرهم۔''[4]

یعنی: ''اس باب میں موجود احادیث سے شوال کے چھ روزوں کے مستحب ہونے کا استدلال کیا گیا ہے۔اور یہی مؤقف امام شافعی،امام احمد اور داؤد رحمھم اللہ وغیرہ کا ہے۔''

❁امام ابن قدامة رحمہ اللہ: ''وجملة ذلك ان صوم ستة ايام من شوال مستحب عند كثير من اهل العلم روي ذلك عن كعب الاحبار والشعبي وميمون بن مهران وبه قال الشافعي۔''[5]

---

[1] شرح سنن ابن ماجة :679/1

[2] سبل السلام :2/340

[3] سبل السلام :2/341

[4] نيل الاوطار:602/4

[5] المغنى لابن قدامة :112/3

یعنی: ''اکثر اہل علم کے نزدیک شوال کے چھ روزے مستحب ہیں اور یہی مؤقف کعب الاحبار رحمہ اللہ، شعبی رحمہ اللہ، میمون بن مہران رحمہ اللہ اور یہی مؤقف امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔''

❀ یہی مؤقف عام متاخرین حنفیہ کا ہے۔[1] اور متاخرین حنفیہ کے بارے میں خود مفتی صاحب کو بھی یہ مسلّم ہے۔ جیسا کہ لکھتے ہیں: ''انہیں مستحب سمجھنا متاخرین حنفیہ یا دوسرے مذاہب کے لوگوں کا خیال ہے۔''[2]

فضائل میں ضعیف احادیث اور شوال کے روزے:

موصوف نے صحیح روایات کو ضعیف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے: موصوف کا انہیں ضعیف ثابت کر لینے کے بعد بھی چارہ نہیں بنتا اس لئے کہ ان کے یہاں تو فضائل میں ضعیف روایت قابل قبول ہوتی ہے۔ آیئے ملاحظہ کیجئے:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ایک قول امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

"الخبر الضعیف عن رسول اللہ اولیٰ من القیاس' ولا یحل القیاس مع وجودہ"۔[3]

یعنی: ضعیف حدیث قیاس سے اولی ہے۔ اور اس ضعیف روایت کی موجودگی میں قیاس جائز نہیں۔

اسی طرح ابن الھمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "الاستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع" ضعیف حدیث جو موضوع کی حد تک نہ پہنچی ہوئی ہو، اس سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔[4]

اس کی مثال جیسے حنفیہ نے سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ضعیف روایت کی بنیاد پر صلوۃ الاوابین کو مستحب قرار دیا۔

ایک طرف تو فضائل میں ضعیف روایت قابل قبول!! لیکن دوسری طرف صحیح روایت بھی اگر قول امام کے

---

[1] فتاوی عالمگیری: 201/1

[2] احسن المقال: 65

[3] المحلیٰ لابن حزم: 161/3

[4] فتح القدیر، باب النوافل: 139/2

خلاف ہوتو اس حدیث کوضعیف ثابت کرنے کے درپے ہوجایا جاتا ہے اور چھوڑ دیا جاتا ہے۔اور ایسا کرتے وقت کیوں بھلا دیا جاتا ہے کہ ضعیف ثابت کرنے کے بعد یہ آپ کے یہاں حجت ہی رہے گی۔ کیونکہ اس کا تعلق فضائل سے ہے۔

ایک طرف صحیح مسلم کی روایت اور دوسری طرف اپنی فقہ کی اندھی تقلید۔تقلید کے جمود میں حنفیہ نے کیا کیا کارنامے کئے یہ داستان بڑی طویل ہے کہ صرف حق تقلید نبھانے کے لئے قرآن واحادیث کے ساتھ کیا کیا نہ کیا گیا؟؟ ہم مفتی صاحب سے بھی یہی کہتے ہیں آپ نے تقلید سے وفا کرنی ہے، بھلے کریں!! لیکن تقلید سے وفا نبھانے کے لئے احادیث کی ہرزہ سرائی نہ کی جائے۔

اور پھر مفتی صاحب نے تو تقلیدِ امام کے ساتھ ایسی وفا نبھائی کہ موصوف کے اپنے حنفیہ کی بڑی تعداد اس مؤقف میں ان کے مقابل کھڑی ہے۔

ماہ شوال سے متعلق فقہی مسائل:

مسئلہ: رمضان کے روزوں کی قضاء سے پہلے شوال کے چھ روزے:

اگر کسی شخص یا عورت کے ذمے رمضان کے روزوں میں سے کچھ باقی ہوں تو وہ کیا رمضان کے روزے مکمل کرے یا شوال کے چھ روزے رکھے؟

اس بارے میں بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کی قضاء پہلے دی جائے اور پھر شوال کے چھ روزے رکھے جائیں۔لیکن اس بارے میں راجح مؤقف یہی ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ پہلے رمضان کے روزوں کی قضاء دی جائے کیونکہ یہ فرض ہیں، البتہ دلائل کی بنیاد پر یہ گنجائش موجود ہے کہ رمضان کی قضاء سے پہلے شوال کے روزے رکھے جاسکتے ہیں، اس لئے کہ قرآن مجید میں رمضان کے روزوں کی قضاء کے بارے میں [فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ] یعنی دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلو۔[1] کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جو کہ پورے سال کو شامل ہیں کہ پورے سال میں اگلے رمضان سے پہلے پہلے روزوں کی قضاء

---

[1] البقرة :184

دی جاسکتی ہے۔لیکن ماہ شوال کے روزے صرف ماہ شوال تک ہی خاص ہیں۔
لہذا رمضان کے روزوں کی قضاء سے پہلے ماہ شوال کے روزے رکھے جاسکتے ہیں، البتہ مستحسن یہی ہے کہ ماہ رمضان کے روزوں کی قضاء پہلے دی جائے۔

مسئلہ: شوال اور کفارے کے روزے:

اس باب میں بھی رمضان کے روزوں کی طرح گنجائش موجود ہے کہ کفارے کے روزوں کو بعد میں رکھا جاسکتا ہےاور شوال کے روزوں کو پہلے۔

مسئلہ: شوال کے چھ روزے متفرق رکھیں یا متتابع:

شوال کے چھ روزے پے در پے بغیر کسی ناغے کے رکھے جائیں یا اس میں تفریق جائز ہے۔اس بارے میں چونکہ حدیث میں کوئی ایسی قید موجودنہیں کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ یہ پے در پے بغیر کسی ناغے کے رکھے جائیں۔لہذا ان روزوں کوکسی بھی ترتیب کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔البتہ انہیں جلدی رکھ لینا افضل ہے۔اس لئے کہ نیکی کے کاموں میں مسابقت مطلوب ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ [سَابِقُوٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ][1] یعنی: تم اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکل جاؤ جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کے برابر ہے۔

اسی طرح [البقرة:148، المائدة:48] میں یہ مضمون بیان ہے۔

اسی طرح سیدنا موسی علیہ السلام نے کہا تھا کہ [قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى][2] یعنی: موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:''وہ لوگ بھی میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں اور میں نے تیرے حضور آنے میں اس لئے جلدی کی تا کہ تو مجھ سے خوش ہوجاؤ۔''

خلاصہ یہ ہے کہ ان ادلہ کی بناء پر روزوں کے رکھنے میں جلدی مستحسن ہے، اور جلدی کے مفہوم میں دونوں چیزیں آجاتی ہیں، یعنی عید کے بعد ماہ شوال کے ابتدائی دنوں میں ہی رکھنا اور پے در پے رکھنا۔تاہم

---

[1] الحدید:21

[2] طه :84

پورے ماہ شوال تک اور کسی بھی ترتیب کے ساتھ روزے رکھنے میں توسّع موجود ہے۔

مسئلہ: شوال کے چھ روزوں کی قضاء:

اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ماہ شوال میں یہ چھ روزے نہ رکھ سکا یا کچھ رکھ لئے لیکن مکمل نہ کر سکا تو کیا ایسا شخص ان روزوں کی قضاء کے طور پر دوسرے مہینے میں رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک عورت ماہ رمضان میں مثلاً دس رمضان کو نفاس والی ہوگئی اور چالیس دن نفاس میں رہنے کے بعد پاک ہوئی اور اب رمضان کے روزوں کی قضاء دینا شروع کی تو ماہ ذی القعدہ آ گیا۔ اور ماہ شوال کے چھ روزے نہ رکھ پائی؟

ماہ شوال کے ان روزوں کی قضاء نہیں ہے۔ اس لئے کہ نفلی اعمال کی قضاء نہیں ہوتی۔ اور اس لئے بھی کہ اگر اس کی قضا کو عام رکھا جائے تو حدیث میں بالا ختصاص شوال کے ذکر کا کوئی معنی نہیں رہتا۔ لہٰذا اگر کوئی یہ روزے نیت کے باوجود کسی عذر کی وجہ سے نہ رکھ سکا یا چند رکھے لیکن مکمل نہیں کر سکا تو اب بقیہ کی قضاء نہیں دے گا البتہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ اسے اس کی نیت کے بقدر اجر مل جائے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''انما الاعمال بالنیات'' یعنی: تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر موقوف ہے۔[1]

مسئلہ: شوال کے چھ روزوں سے صیام الدھر کے استحباب پر استدلال:

بعض لوگوں نے اس حدیث سے استحباب صیام الدھر کے جواز پر استدلال کیا ہے۔[2]

جواب: امام صنعانی رحمہ اللہ صوم الدھر کے حوالے سے اختلاف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس تشبیہ کا معنی یہ ہے کہ جس طرح پانچ نمازیں پچاس سے کفایت کر جاتی ہیں، اسی طرح یہ ایام بیض یا شوال کے روزے سال بھر کے روزوں سے کفایت کر جاتے ہیں لہذا جس طرح اب کوئی پچاس نمازیں پڑھے اسے ثواب نہیں بلکہ گناہ ہی ملے گا۔ اسی طرح جو ہمیشہ کے روزے رکھے وہ بھی ثواب کا مستحق نہیں۔ (جیسا کہ صیام الدھر سے متعلق نہی والی احادیث میں صراحت موجود ہے۔)[3]

---

[1] صحیح بخاری: 1، کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، صحیح مسلم: 1907، کتاب الامارۃباب قوله صلى الله عليه وسلم إنما الأعمال بالنية وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال

[2] دیکھئے: سبل السلام: 2/341

[3] سبل السلام: 341/2

صیام الدھر کی کراہیت سے شوال کے روزوں کی کراہیت پر استدلال:

جس طرح بعض نے صیام الدھر کے استحباب پر استدلال کیا جو کہ غلط تھا اسی طرح بعض نے اس کے بالکل برعکس صیام الدھر کے روزوں کے مکروہ ہونے سے شوال کے چھ روزے مکروہ ہونے کا استدلال کیا گیا۔[1]

جواب: یہ استدلال کرنا بھی بالکل غلط ہے۔اس لئے کہ صریح روایت میں صیام الابد کے روزوں سے روکا گیا ہے۔جب کہ یہاں صیام الابد کے روزے رکھنے کا نہیں اس کے اجر کا ذکر ہے اور مزید یہ کہ بعض روایات میں اس کی بھی وضاحت ہے کہ وہ کس طرح سال بھر کے روزے بنتے ہیں یعنی رمضان کا ثواب دس مہینوں کے برابر اور شوال کے چھ روزوں کا ثواب دو مہینوں کے برابر اس طرح پورے سال کے روزوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

امام سندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ممکن ہے کہ جو ان روزوں کو مکروہ سمجھتا ہو وہ حدیث کی یہ تاویل کرے کہ یہ مکروہ ہونے میں ہمیشہ کے روزوں کی طرح ہے۔اور حدیث میں آیا ہے کہ جس نے ہمیشہ روزے رکھے اس کا روزہ نہیں۔جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمیشہ کے روزے مکروہ ہیں۔لیکن یہ تاویل مردود ہے۔کیونکہ اس سے مراد حقیقت میں مستقل روزے رکھنا مقصود ہے اس لئے کہ حدیث میں ہر مہینے کے تین روزے (ایام بیض) اور اس جیسے دیگر روزوں کے بارے میں ہے کہ ان کا اجر سال کے روزوں کے برابر ہے۔ظاہراً ہمیشہ کے روزے رکھنا مکروہ ہیں۔اور جو پورے زمانے کے روزے نہیں اور ان کے بارے میں یہ وارد ہوا ہے کہ یہ زمانے کے روزے (کی طرح ہیں) تو یہ محبوب ہیں۔''[2]

مسئلہ: شوال کے روزے اور کفارہ قسم کے روزوں کا جمع کرنا:

ایک شخص شوال کے چھ روزے بھی رکھنا چاہتا ہے اور اس پر قسم کے کفارہ کے تین روزے بھی ہیں اب کیا ایک روزے میں یہ دونوں نیتوں کا جمع ہونا صحیح ہے۔

---

[1] دیکھئے احسن المقال : 28

[2] شروح سنن ابن ماجة :679/1

جواب: ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ دونوں مستقل عبادات ہیں اور دونوں کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ ہی ادا کیا جائے گا۔

مسئلہ: رمضان کے روزوں کی قضاء اور شوال کے چھ روزوں کا جمع ہونا:

اگر ایک شخص پر رمضان کے روزوں کی قضاء ہے اور وہ شوال کے چھ روزوں میں ہی ان کی قضاء بھی ادا کرے تو کیا ایسا جائز ہے؟

اگرچہ بعض اہل علم اس باب میں رخصت دیتے ہیں [1] لیکن احوط یہ ہے کہ ایسا جائز نہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ: پیر اور جمعرات اور شوال کے چھ روزوں کا جمع کرنا:

اگر ایک شخص پیر اور جمعرات کے روزے کی ترتیب کے اعتبار سے شوال کے چھ روزوں کی نیت بھی کر لیتا ہے؟ کیا اسے دونوں اجر ملیں گے۔

ایسی صورت میں اجر کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہاں پیر اور جمعرات کے لحاظ سے ترتیب بنانا اس شخص کے دونوں اجروں کو پانے کی نیت سے ہے جو کہ استباق فی الخیرات ہے اور یہ مطلوب ہے۔ اس لئے امید رکھی جاسکتی ہے کہ اسے دونوں کا اجر ملے گا۔ ان شاء اللہ

مسئلہ: ایام بیض اور شوال کے چھ روزوں کا جمع کرنا:

چونکہ یہ فضیلت میں جمع ہیں اس لئے یہ جمع کئے جاسکتے ہیں۔

مسئلہ: احناف حضرات رمضان میں تو اذان بروقت دیتے ہیں، لیکن عام دنوں میں اپنے مؤقف کے مطابق احتیاطی طور پر اذان دیر سے دیتے ہیں۔ بعض اہل حدیث ان کی اذان کے مطابق سحری ختم کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ایسا کرنا غلط ہوگا اور یہ روزہ بھی نہیں ہوگا، لہذا اس معاملے میں احتیاط ضروری ہے اور سلفی مساجد کی اذان کے مطابق ہی روزہ رکھا جائے۔ اگر سلفی مسجد کی اذان سنائی نہ دے تو ان کی اذان کا وقت معلوم کر کے اسی وقت کے مطابق روزہ رکھا جائے۔

---

[1] مقالات و فتاوی: 396/15

شوال کے روزوں سے متعلق ضعیف روایات:

شوال کے روزوں کے بارے میں کچھ ضعیف روایات بھی ہیں، جن میں سے چند ایک کی ذیل میں نشاندہی کی جاتی ہے۔

(1)عن ابن عمر قال قال رسول الله من صام رمضان وا تبعه ستا من شوال خرج من ذنوبه كيوم ولدته ا مه -[المعجم الاوسط:8622]

ترجمہ:ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر شوال کے چھ روزے رکھے وہ گناہوں سے ایسے پاک ہوجائے گا جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہے۔

یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔اس کی سند میں مسلمۃ بن علی الخشنی ضعیف ہے۔نیز صحیح احادیث کے خلاف ہے۔اس لئے منکر ہے۔

(2)عن عكرمة بن خالد عريف من عرفاء قريش حدثني ا بي ا نه سمع من في رسول الله قال من صام شهر رمضان وستا من شوال والا ربعاء والخميس دخل الجنة[مسند احمد:78/3]

ترجمہ:قریش کے سرداروں میں سے ایک سردار کہتے ہیں کہ ان کے والد نے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے سنا، انہوں نے فرمایا:جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اور پھر شوال کے چھ روزے رکھے پیر اور جمعہ کے روزے رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اس کی سند میں عریف (سردار) مجہول ہے،اس لئے روایت سنداً ضعیف ہے۔

(3)عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صام ستة أيام بعد الفطر متتابعة فكأنما صام السنة(المعجم الاوسط:7607)

ترجمہ:سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:جو عید الفطر کے بعد پے در پے چھ روزے رکھے گویا کہ اس نے پورے سال کے روزے رکھے۔

یہ روایت منکر ہے،جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”میرے نزدیک دو وجہوں سے یہ

روایت منکر ہے۔(1) سعید بن الصلت کو میں نہیں جانتا۔(2) سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی مسند بزار وغیرہ میں دو سندوں سے روایت میں ''متتابعۃ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ نیز حدیث ابی ایوب رضی اللہ عنہ وغیرہ میں بھی نہیں ہیں۔''[1]

یہ تین روایات کی طرف نشاندہی کر کے ہم اپنے موضوع کو سمیٹتے ہیں۔آخر میں دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی ہماری اس حقیری کوشش کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔(آمین)

توجہ فرمائیں

البیان کے گذشتہ شمارہ (۹/۱۰) میں فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب حفظہ اللہ کا مضمون ''حلالہ کی شرعی حیثیت'' شائع ہوا تھا۔ مذکورہ مضمون کی ایک قسط باقی ہے جو قارئین آئندہ شمارہ (۱۲) میں ملاحظہ فرما سکیں گے۔ان شاء اللہ۔

جزاکم اللہ خیرا

---

[1] السلسلة الضعيفة:5189

برصغیر (پاک و ہند) میں
علم حدیث

شاہ ولی اللہ دہلوی۔۔تا۔۔مولانا محمد علی جانباز رحمہا اللہ

1176ھ تا 1429ھ

عبدالرشید عراقی [1]

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ:

شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم 4 شوال 1114ھ (فروری 1703ء) صوبہ اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کے قصبہ ''پھلت'' میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے خلیفۂ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور والدہ محترمہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ سے جاملتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات تعارف کی محتاج نہیں، آپ بیک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی، فقیہ بھی تھے اور مجتہد بھی، متکلم بھی تھے اور معلم بھی، اور اس کے ساتھ عربی و فارسی کے عظیم مصنف بھی تھے۔

مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (متوفی 1307ھ) فرماتے ہیں:

انصاف این است کہ اگر وجود او در صدر اول و زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد

حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود گرامی اگر دور اول اور زمانہ ماضی میں ہوتا تو ان کا شمار امام الائمہ اور سربرآوردہ مجتہدین کی جماعت میں کیا جاتا۔ [2]

---

[1] نامور مؤرخ و مصنف کتب کثیرہ [2] اتحاف النبلاء، ص: 43

حضرت شاہ صاحب پوری زندگی اس کوشش میں رہے کہ برصغیر میں کتاب وسنت کا مضبوط عَلَم گاڑ دیا جائے جو کبھی بھی سرنگوں نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس میں کامیاب وکامران فرمایا، ان کی اس سعی وکوشش اور جدوجہد کا تذکرہ شیخ محمد اکرم مرحوم نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

دنیائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے جن سے آپ (شاہ ولی اللہ) پیچھے رہے ہیں آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ علم کلام غرض کہ علوم اسلام کی کوئی شاخ نہیں جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو ہاتھ لگاتے کندن ہو جاتی۔ (1)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی خدمت حدیث:

1142ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ حج بیت اللہ کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے وہاں آپ کا قیام 1145ھ تک رہا۔ حرمین شریفین کے قیام میں آپ نے علامہ شیخ ابو طاہر الکردی رحمہ اللہ اور دوسرے اساتذہ حرمین شریفین سے علوم اسلامیہ اور خاص علم حدیث میں استفادہ کیا۔ 1145ھ میں جب شاہ صاحب واپس ہندوستان آنے لگے تو اپنے استاد شیخ ابو طاہر الکردی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی خدمت میں عرض کیا کہ

''میں نے جو کچھ پڑھا تھا، سب بھلا دیا سوائے علم دین حدیث کے''

حضرت شاہ صاحب کی پوری زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ حدیث نبوی ﷺ کی تشریح وتفہیم تدریس وتعلیم اور اشاعت وتعمیم میں مصروف رہے۔ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ

جناب شاہ ولی اللہ کا علوم متداولہ میں وہ پایہ تھا جس کا شمہ بھی بیان کرنے سے انسانی طاقت محض عاجز ہے، آپ فنون عقلیہ میں وہ دستگاہ رکھتے تھے جس کا عشر عشیر بھی دوسروں کو نصیب نہ تھا۔ قطع نظر ان تمام علوم کے حدیث میں اپنے تمام ہم عصروں سے امتیازی قوت رکھتے تھے اور اس علم میں مقتدائے وقت اور فرید عصر شمار کئے جاتے تھے۔ (2)

ہندوستان واپس آتے ہی حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی نشر واشاعت کے لیے گویا کمر کس لی اور ان کا آبائی مدرسہ رحیمیہ ہندوستان کے طول وعرض میں حدیث کی سب سے بڑی درسگاہ بن گئی جہاں برصغیر کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم حدیث نے پروانہ وار ہجوم کیا۔

---

(1) رودِ کوثر، ص:551 (2) اتحاف النبلاء، ص:430

حضرت نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں: جناب شاہ ولی اللہ کی درسگاہ اس وقت علوم حدیث وتفسیر کا مخزن اور فقہ حنفی کا سرچشمہ تھی اس مقدس اور بلند پایہ علم کی خدمت میں جس قدر آپ سے وجود پذیر ہوئی، فی الواقع ہندوستان میں کوئی شخص اس کا دعوے دار نہیں بن سکتا۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے بے شمار علماء نے حدیث میں استفادہ کیا آپ کے مشہور تلامذہ جنہوں نے علم وادب میں اپنا ایک مقام پیدا کیا اور اہل علم واہل قلم نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔اور وہ تھے۔

آپ کے صاحبزادگان ذی شان، شاہ عبدالعزیز محدث (متوفی 1239ھ)، شاہ رفیع الدین محدث (متوفی 1233ھ)، شاہ عبدالقادر محدث (متوفی 1230ھ)، شاہ عبدالغنی محدث (متوفی 1227ھ) علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی (متوفی 1205ھ) صاحب ''تاج العروس'' علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی 1225ھ) صاحب تفسیر مظہری۔

خدمت حدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفی خدمات حسب ذیل ہیں۔

موطا امام مالک کی دو شرحیں المسوّی (عربی) اور المصفی (فارسی)، تراجم ابواب البخاری (عربی) ان کے علاوہ چار اور رسائل بھی ہیں۔

مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشیروی (متوفی 1386ھ) لکھتے ہیں کہ

جناب حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ نے حدیث کی اول الکتب موطا امام مالک رحمہ اللہ کی دو شرحیں (عربی وفارسی میں) بنام المسویٰ اور المصفیٰ لکھیں، اور تقلیدی بندھنوں سے بے نیاز رہ کر اُس مجتہدانہ شان کے ساتھ کہ 12 ویں صدی ہجری کے مجدد کا فرض تھا ان دونوں کا گویا ضمیمہ ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' کے نام سے لکھا تکملہ ''عقد الجید فی أحکام الاجتہاد والتقلید'' سے کیا اور تتمہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' جیسی غیر مسبوق کتاب سے۔

حجۃ اللہ البالغہ دین کی محبت بنی اس کے ابلاغ نے حق وباطل میں امتیاز کر دیا اس ے ک ایک ایک لفظ نے تشویق الی السنۃ اور تحریض عمل بالحدیث کا درس دیا۔[2]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (متوفی: 1999ھ) فرماتے ہیں کہ

شاہ ولی اللہ صاحب فقہ حدیث اور درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے یہ دونوں کتابیں (المسویٰ والمصفی) اس کا نمونہ ہیں اور ان سے شاہ صاحب کی علوم حدیث اور فقہ حدیث

---

[1] اتحاف النبلاء، ص: 430، [2] ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات، ص: 14

میں محققانہ اور مجتہدانہ شان کا اظہار ہوتا ہے وہ موطا کو صحاح ستہ میں پہلے درجہ پر رکھتے ہیں اور اس کو ان میں ابن ماجہ کی جگہ شمار کرتے تھے وہ موطا کے بے حد قائل اور اس کے ساتھ اعتناء کرنے اور اس کو درس حدیث میں اولیت دینے کے پر جوش داعی اور مبلغ ہیں۔ (1)

شرح تراجم ابواب البخاری

صحاح ستہ کے مولفین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنی کتابوں کا انتخاب کیا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کے پیش نظر طرق استنباط اور استخراج مسائل ہے جو ان کے تراجم ابواب سے ظاہر ہے اہل درس کا مشہور مقولہ ہے کہ ''بخاری کی ساری کمائی ان کے تراجم میں ہے''

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس رسالہ کی شرح بزبان عربی کی ہے یہ رسالہ مطبوع ہے۔

وفات

حضرت شاہ ولی اللہ نے 29 محرم الحرام 1176ھ بروز شنبہ (21 اگست 1762ء) ظہر کے وقت دہلی میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

عمر 62 سال تھی اور تدفین قبرستان ہندویاں بیرون دلّی دروازہ میں ہوئی۔ (2)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرزند اکبر تھے۔ 25 رمضان المبارک 1159ھ/1745ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ 15 سال کی عمر میں علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت پائی، علم وفضل کے اعتبار سے جامع الکمالات تھے صاحب علم وعمل وقائع عبد القادر درخانی لکھتے ہیں کہ

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرہ آفاق تھے، اور ہیت، ہندسہ، مناظر، اضطرلاب، جرثقیل، طبعیات، الٰہیات، منطق، مناظرہ، اتفاق، اختلاف، ملل ونحل، قیافہ، تحلیل، تطبیق، مختلف اور طریق تشبیہ میں یکتائے زمانہ تھے۔ (3)

17 سال کے تھے کہ آپ کے والد محترم حضرت شاہ ولی اللہ واصل بحق ہوئے اور آپ مسند ولی اللہی دہلوی پر براجمان ہوئے اور پوری زندگی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدریس فرمائی۔ ان کے تلامذہ کی فہرست

---

(1) تاریخ دعوت وعزیمت 5/192 (2) تاریخ دعوت وعزیمت 5/127 (3) علم وعمل 2/246

بھی طویل ہے مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدین محدث (برادر خورد)، مولانا شاہ محمد اسحاق، مولانا شاہ محمد یعقوب پسران شیخ محمد افضل سیالکوٹی (آپ کے نواسے) مفتی صدر الدین خان آزردہ دہلوی، مولانا غلام علی دہلوی، مولانا سید عبد الخالق دہلوی، مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی، مولانا شاہ عبد الحی بڈھانوی، مولانا شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی، مولانا خرم علی بلہوری۔ [3]

حضرت شاہ عبد العزیز تمام علوم اسلامیہ وعقلیہ ونقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے تصنیف وتالیف اور وعظ وتبلیغ اور تقریر میں بلا کا جادو تھا آپ کی شیوہ بیانی کا ہر موافق ومخالف پر یکساں اثر ہوتا تھا سید نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کثرتِ حفظ، علم تعبیر رؤیاء، سلیقہ وعظ وانشاء تحقیقات علوم اور حریف کے ساتھ بحث ومناظرہ میں اپنے تمام اقران ومعاصرین میں ممتاز تھے اور اس باب میں ان کے مخالف وموافق ان کا لوہا مانتے تھے عمر بھر تدریس وفتویٰ نویسی، مختلف علمی معرکوں میں فیصلہ کرنے وعظ ونصیحت، مریدوں کی روحانی تربیت اور شاگردوں کی علمی رہنمائی میں مصروف رہے۔ [1]

خدمت حدیث میں شاہ عبد العزیز کی تصنیفی خدمات

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی خدمت حدیث کے بارے میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک درس حدیث اور اس کی ترویج واشاعت کا تعلق ہے، ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے، آپ کے درس حدیث کی مدت تقریباً 64 سال کی ہے۔ اس مدت میں آپ نے نہ صرف صحاح کا درس دیا اور بستان المحدثین، العجالۃ النافعہ جیسی مفید کتابیں تصنیف کیں، جو حدیث کا صحیح ذوق، طبقات حدیث سے واقفیت اور محدثین کا مرتبہ شناس بتاتی اور اصول سے واقف کراتی ہیں جن میں سینکڑوں صفحات کا عطر آ گیا ہے آپ نے حدیث کے ایسے اساتذہ کاملین اور تلامذہ راشدین پیدا کیے جنھوں نے ہندوستان ہی میں نہیں حجاز میں بھی درس حدیث کا فیض عام کیا۔ [2]

عجالہ نافعہ

یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے اور اس کا موضوع اصول حدیث ہے، یہ رسالہ حضرت شاہ عبد العزیز نے

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند، ص: 58-59، [2] اتحاف النبلاء، ص: 296، [3] تاریخ دعوت وعزیمت 5/358

سید قمر الدین حسینی رحمہ اللہ کی خواہش پر تحریر فرمایا، اس مختصر رسالے میں حضرت شاہ صاحب نے مصطلحات حدیث اور اس کی اقسام و مراتب اور حدیث کی تنقید کے اصول وقواعد نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر ثریا ڈار صاحبہ اس رسالہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ

اس رسالے کی فصل اول میں علم حدیث کے فوائد کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ علم القرآن عقائد اسلام اور احکام شریعت اور اصولِ طریقت سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر موقوف ہیں۔ تمام کشفی باتوں اور عقلی معاملوں کے زروجواہر کو پرکھنے کے لیے علم حدیث کی اتباع لازمی ہے کیونکہ علم حدیث دونوں جہانوں کا سرمایۂ سعادت اور حیاتِ جاودانی کی دلیل راہ ہے۔ [1]

اس رسالہ کا عربی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے، عربی ترجمہ ڈاکٹر حافظ عبد الرشید اظہر رحمہ اللہ اور اردو میں ترجمہ مولانا محمد عبد الحلیم چشتی رحمہ اللہ نے کیا ہے دونوں ترجمے مطبوع ہیں۔

بستان المحدثین

یہ کتاب بھی فارسی میں لکھی گئی ہے یہ کتاب محدثین کرام کے حالات اور کتب احادیث کے تعارف میں ہے، یہ کتاب فن تاریخ کا ایک بہترین ذخیرہ ہے اور اہل علم کے نزدیک یہ کتاب بڑی معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز نے اس کتاب کا آغاز موطا امام مالک رحمہ اللہ سے کیا ہے اور موطا کے (16) نسخوں کا تعارف کرایا ہے اور کتب حدیث کا تعارف اس کی پہلی حدیث سے کرایا ہے یہ کتاب بڑی معلوماتی اور اہل علم کے لیے نافع ہے۔

شیخ محمد محسن اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

منها كتابه بستان المحدثين جمع فيه علوم الحديث مهذبة و اختصر ها

یعنی شاہ عبد العزیز کی تصانیف میں ایک کتاب بستان المحدثین ہے جس میں انہوں نے علوم حدیث کو عمدہ اور مختصر انداز میں جمع کر دیا ہے۔ [2]

وفات

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے 4 شوال 1239ھ/ 1822ء بعد نماز فجر دہلی میں انتقال کیا۔ انا للہ

[1] شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص:259 [2] الیانع الجنی، ص:74

وانا الیہ راجعون اور قبرستان ہندیاں میں اپنے والدمحترم حضرت شاہ ولی اللہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ [1]

مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی

مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی بن مولانا شاہ عبدالغنی محدث بن امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی 12 ربیع الثانی 1193ھ مطابق 12 اپریل 1779ء قصبہ پھلت ضلع مظفرنگر (اُتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ 6 سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا اور 8 سال کی عمر حفظ قرآن مجید کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے اسلامی علوم کی تدریس کی ابتداء اپنے والد شاہ عبدالغنی محدث سے کی۔

1227ھ میں آپ کے والد محترم نے انتقال کیا تو اس کے بعد مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے اپنے یتیم بھتیجے کی سرپرستی فرمائی اور ان کو تمام علوم اسلامی پڑھائے۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ اسمٰعیل شہید کو ذہانت وذکاوت سے نوازا تھا چنانچہ بہت تھوڑی عمر میں تمام علوم اسلامی پر حاوی ہوگئے، مولانا سید نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ

> شاہ محمد اسمٰعیل بن شاہ عبدالغنی محدث علوم معقول ومنقول میں اس درجے ماہر تھے کہ انہیں دیکھ کر پُرانے لوگوں کی یاد ذہن سے نکل جاتی۔ فروع واصول میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ائمہ سے بھی بڑھ گئے تھے جس علم کے بارے میں آپ نے ان سے بات کی یہ جانا کہ یہ اس کے امام ہیں اور جس فن میں آپ ان سے مصروف گفتگو ہوئے یہ محسوس کیا کہ یہ اس کے حافظ ہیں۔ اصول فقہ نوک زبان تھا اور قواعد حساب چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے علوم قرآن وحدیث ان کے سینے میں محفوظ تھے اور فقہ ومنقول میں انہیں پوری مشق حاصل تھی۔ [2]

علم وفضل

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید علم وفضل کے اعتبار سے جامع الکمالات تھے آپ بہت بڑے مبلغ، واعظ اور مقرر تھے ان کی تقریر میں بڑا جادو تھا جو شخص ان کی تقریر اور وعظ سنتا وہ مسحور ہوجاتا اور ان کا مطیع اور مرید ہوجاتا۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرمایا کرتے تھے:

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند، ص:62 [2] اتحاف النبلاء، ص:27-28

میری تقریر اسمٰعیل نے لے لی تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے۔ [1]

شاہ صاحب ایک جیّد عالم، دینی مفکر، قاطع بدعت، بلند پایہ مبلغ وواعظ، اعلیٰ پایہ کے خطیب ومقرر، عظیم مجتہد، مفکر، مدبر، محدث، فقیہ، مورخ محقق، انشا پرداز، غیر معمولی بصیرت کے مالک، متقی، پرہیزگار، زہد وورع کے پیکر، متواضع، ذہین وفریس، تقوی وطہارت میں اعلیٰ وارفع، شجاع، بہادر، اور بے پناہ بصیرت کے مالک تھے۔

مولوی رحمان علی بریلوی ان کے علم وفضل اوران کی علمی بلندی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

ان مولوی عبدالغنی بن مولانا شاہ ولی اللہ دور یاضت ورسائی فکر یگانہ روزگار ومشارٌ الیہ علمای کبار بود

یعنی شاہ عبدالغنی کے یہ فرزند اور شاہ ولی اللہ کے پوتے دیانت اور فہم وفکر میں یگانہ روزگا تھے حلقہ علمائے کبار میں مشارٌ الیہ تھے۔ [2]

مولانا سید نواب صدیق حسن خان حضرت شاہ محمد اسمعیل شہید کی عظیم شخصیت اوران کے علمی تبحر اوران کی عدالت وثقاہت، شجاعت وبسالت، امانت ودیانت اور ذکاوت وخلافت کے بارے میں فرماتے ہیں

ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت خود وفرید دہر وحید عصر در علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر وفصاحت تحریر وورع وتقویٰ ودیانت وامانت ومراتب وولایت بود علم چنیں اولاد اولاد...ایں سلسلہ از طلائے ناب است

یعنی اس خاندان کا ہر فرد علم، عمل، عقل وفہم، زور تقریر، فصاحتِ تحریر، ورع وتقویٰ، دیانت وامانت اور مراتب ولایت میں یگانہ روزگار، فرید دہر اور وحید عصر تھا اور ان کی اولاد کی اولاد بھی انہی درجات بلند پر فائز تھی یہ ایک زریں سلسلہ تھا۔ [3]

حضرت نواب صاحب اپنی دوسری کتاب ''ابجد العلوم'' میں خاندان شاہ ولی اللہ دہلوی کے بارے میں فرماتے ہیں:

وكلهم كانوا علماء نجباء حكماء فقهاء كأسلافهم وأعمامهم كيف وهم من بيت العلم الشريف والنسب الفاروقي المنيف

خاندان شاہ ولی اللہ دہلوی کے تمام علماء، حکماء، فقہاء، چمکتے ہوئے سورج کی مانند تھے اور اپنے اسلاف کی طرح فقیہ تھے اور علم شریف میں پختہ تھے اور نسب کے لحاظ سے فاروقی خاندان کے

---

[1] تواریخ عجیبہ، ص:142 [2] تذکرہ علمائے ھند، ص:179 [3] اتحاف النبلاء، ص:430

چشم و چراغ تھے۔

علامہ اقبال حضرت شاہ اسمعیل شہید دہلوی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ
ہندوستان نے ایک مولوی پیدا کیا اور وہ مولوی شاہ محمد اسمعیل کی ذات تھی۔ (1)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (متوفی 1999ء) لکھتے ہیں:

جہاں تک مولانا شاہ محمد اسمعیل شہید کا تعلق ہے وہ ان اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ مجتہدانہ دماغ کے مالک تھے اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ ان میں بہت سے علوم کے از سر نو مدون کرنے کی قدرت وصلاحیت تھی۔ (2)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی مولانا شاہ محمد اسمعیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کیا کرتے تھے: الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمعیل واسحاق

اس اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمعیل (بھتیجا) اور اسحاق (نواسہ) عطا فرمائے۔ (3)

مولانا شاہ اسمعیل شہید دہلوی کی دو بے نظیر تصانیف

1۔تقویۃ الایمان (اردو) 2۔تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین (عربی)

تقویۃ الایمان

یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کی عربی کتاب ''ردالاشراک'' کے پہلے حصہ کا اردو ترجمہ ہے اس کتاب میں شاہ صاحب نے قرآن کریم کی (36) آیات اور (47) احادیث سے دلائل پیش کرتے ہوئے شرک وبدعت کا رد کیا ہے۔

تقویۃ الایمان سے خلق اللہ کو وہ فاہدہ پہنچا اور عقائد کی ایسی اصلاح ہوئی کہ شاید کسی حکومت کی منظم کوشش سے مشکل سے ہوتی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس (تقویۃ الایمان) سے بہت ہی نفع ہوا چنانچہ مولوی اسمعیل کی حیات ہی میں دو ڈھائی لاکھ آدمی درست

---

(1) رسپکٹس آف شاہ اسمعیل شہید از عبداللہ بٹ، ص: 44، (2) تاریخ دعوت وعزیمت 5/375،

(3) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:108

ہو گئے تھے اور ان کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ (1)

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (متوفی 1987ء) لکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویۃ الایمان جو شخص بھی صاف ذہن سے پڑھے گا وہ محسوس کرے گا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ (2)

تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین

یہ کتاب عربی میں ہے اس میں حضرت شاہ صاحب نے متعدد احادیث سے نماز میں رفع الیدین کرنے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور اس کتاب کی تصنیف کے بعد مولانا شہید رحمہ اللہ نے خود ہی رفع الیدین پر عمل شروع کر دیا تھا علاوہ ازیں اس کتاب میں آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام کی طرف اشارات کئے گئے ہیں اور کتاب کے آخری باب میں تقلید شخصی کی بدلائل تردید کی گئی ہے۔

جب یہ کتاب حضرت شاہ صاحب نے تالیف کی تو مولانا شاہ عبد القادر محدث اور مولانا شاہ عبد العزیز محدث حیات تھے مولانا سید نواب صدیق حسن خاں اپنی کتاب ''اتحاف النبلاء'' میں لکھتے ہیں کہ:

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہم اللہ نے یہ کتاب پڑھ کر اظہار پسندیدگی فرمایا تھا اور حضرات شاہ عبد العزیز محدث نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ گھر محققین علم حدیث سے خالی نہیں ہے۔ (3)

تنویر العینین کے شائع ہونے سے مقلدین حضرات کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور ان کی نیندیں حرام ہو گئیں چنانچہ مولوی محمد شاہ پاک پٹنی جو ایک غالی مقلد تھے (حدیث میں شیخ الکل حضرت میاں سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی (متوفی 1320ھ) کے شاگرد تھے ''تنویر الحق'' کے نام سے ''تنویر العینین'' کا جواب دیا۔

تنویر الحق کی تردید میں حضرت میاں سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی ''معیار الحق'' تالیف فرمائی اور ان تمام اعتراضات کا جواب دیا جو مولوی محمد شاہ صاحب نے اپنی کتاب ''تنویر الحق'' میں کیے تھے۔ معیار الحق کی اشاعت سے مقلدین حضرات بوکھلا اُٹھے چنانچہ ایک اور غالی مقلد مولوی ارشاد حسین رام پوری (متوفی 1311ھ) نے معیار الحق کے جواب میں ''انتصار الحق'' لکھی، معیار الحق اور انتصار الحق یہ دونوں

(1) اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان، ص:13، (2) أیضاً، ص:13، (3) اتحاف النبلاء، ص: 44

کتابیں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کے مطالعہ میں آئیں تو مولانا آزاد نے فرمایا:

مجھ پر معیار الحق کی سنجیدہ اور وزنی بحث کا بہت اثر پڑا اور صاحب ارشاد الحق (انتصار الحق) کا علمی ضعف صاف صاف نظر آ گیا۔ (آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی بروایت ملیح آبادی، ص:366)

مولوی ارشاد حسین صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ

میری اس کتاب (انتصار الحق) کا کوئی غیر مقلد عالم جواب نہیں دے سکے گا۔

لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی حضرت میاں صاحب سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے چار تلامذہ نے انتصار الحق کی تردید میں کتابیں لکھیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1 براہین اثنا عشر:

یہ کتاب مولانا سید امیر حسن سہسوانی (متوفی 1291ھ) کی تصنیف ہے۔ مولانا سید امیر حسن سہوانی نے ایک دن میں جواب لکھ کر مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی کو بھیجا مولانا سہوانی کو مولانا عبدالحی نے بذریعہ خط یہ اطلاع دی۔

از محمد عید الحی مولوی صاحب مکرم معظم مجمع البحرین المعقول والمنقول منبع نہرین جامع الفروع الاصول مولوی سید امیر حسن صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنائت نامہ لفف شامہ مورخہ 20 ماہ رواں بوردو خود ساختہ ممتاز ساختہ برائین اثنا عشر، رسید اغلاط سامی کتب ومولفین دو انتصار لا تعدد ہستند شاید بنظر اختصار بر چند کفایت شدہ۔ (الحیاۃ بعد المماۃ، ص:295-296)

دوسرا جواب مولانا سید احمد حسن دہلوی (متوفی 1338ھ) صاحب تفسیر احسن التفاسیر نے بنام ''تلخیص الانظار فیما بنی علیہ الانتصار'' رقم فرمایا

تیسرا جواب مولانا احتشام الدین مرادآبادی (متوفی 1330ھ) نے ''اختیار الحق'' کے نام سے لکھا۔

چوتھا جواب مولانا شہود الحق عظیم آبادی (متوفی 1335ھ) کے قلم سے ''بحر ذخار'' کے نام سے شائع ہوا۔

یہ چاروں کتابیں استاد پنجاب حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کے کتب خانہ میں موجود تھیں اور راقم کی نظر سے گزری تھیں راقم نے حضرت میاں صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا جو ماہنامہ ''المعلم'' خانیوال میں شائع ہوا تھا، اس میں راقم نے ان چاروں کتابوں کے صفحات مع سن اشاعت وغیرہ کی نشاندہی کی

تھی۔مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ نے ان چاروں کتابوں کے فوٹو اسٹیٹ کرائے تھے معلوم نہیں کہ یہ چاروں نسخے اس وقت الدار الدعوۃ السّلفیہ کی لائبریری میں موجود ہیں یا نہیں (المعلم خانیوال کا مکمل فائل امام بخاری یونیورسٹی سیالکوٹ کی لائبریری میں موجود ہے)

معیار الحق کا نسخہ جو میرے پیش نظر ہے وہ مطبع رحمانی دہلی 1337ھ/1919ء کا مطبوع ہے۔

پاکستان میں موجود محمد حنیف یزدانی مرحوم نے بھی شائع کیا تھا، مئی 2007ء میں مولانا محمد یحییٰ گوندلوی مرحوم نے شائع کیا۔

شہادت

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل رحمہ اللہ 24 ذی قعدہ 1246ھ مطابق 5 مئی 1831ء کو حضرت امیر المومنین سید احمد شہید کے ہمراہ بمقام بالاکوٹ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کنداین عاشقانِ پاک طینت را

(تراجم علمائے حدیث ہند، ص:92)

شاہ محمد اسحاق دہلوی

حضرت شاہ محمد اسحاق بن شیخ محمد افضل فاروقی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ 1192ھ بمطابق 1779ء دہلی میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلہ نسب والد اور والدہ کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

آپ نے علوم اسلامیہ کی تکمیل اپنے نانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث، مولانا شاہ رفیع الدین محدث اور مولانا شاہ عبدالقادر محدث رحمہم اللہ سے کی، فراغت تعلیم کے بعد مدرسہ رحیمیہ دہلی میں مسند تدریس پر فائز ہوئے اور 20 سال تک حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی زیر نگرانی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ 1239ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور 1258ھ تک آپ مدرسہ رحیمیہ کے صدر مدرس رہے۔ 1258ھ میں آپ نے اپنے برادر اصغر مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی حرمین شریفین ہجرت کی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کی ساری زندگی درس وتدریس میں گزری ان کے تلامذہ کی تعداد کا شمار نہیں، علامہ

سید سلیمان ندوی (متوفی 1373ھ) فرماتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی تھی تمام بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے، چند رسالے بھی ان کی تصنیف ہیں غدر کے بعد مکہ معظّمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور وہاں بھی سلسلہ فیض جاری رہا آخر وہیں 1262ھ میں وفات پائی ان کے تلامذہ میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، نواب صدر الدین خاں دہلوی، نواب قطب الدین خاں (جنہوں نے کتب حدیث کا اردو میں ترجمہ کیا ہے) مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب بہاری دہلوی، مولانا عالم علی مراد آبادی، شیخ محمد تھانوی، مولانا شاہ فضل رحمان گنج آبادی، مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی ہیں۔

(مقالات سلیمان 2/52)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت جلد پنجم میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خدمت حدیث نبوی ﷺ اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی تدریس حدیث کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

حدیث کی سب سے بڑی اشاعت حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے ذریعہ ہوئی جنہوں نے 1258ھ میں مکہ معظّمہ ہجرت کی اور ان سے حجاز کے ممتاز علماء نے حدیث کی سند لی۔

(تاریخ دعوت وعزیمت 5/359)

فضل وکمال

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا حلقہ درس نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب تک پھیلا ہوا تھا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے 1176ھ میں وفات پائی تو ان کی مسند ولی اللہ دہلوی پر ان کے سب سے بڑے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث رونق افروز ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کے تینوں چھوٹے بھائی ان سے پہلے اس دنیائے فانی سے رحلت فرما چکے تھے، تفصیل وفات اس طرح ہے۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلوی (متوفی 1227ھ)
شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (متوفی 1230ھ)
شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (متوفی 1233ھ)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وفات 1239ھ کے بعد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی آپ کے جانشین اور خاندان ولی اللہ دہلوی کی مسند علم وارشاد کے وارث ہوئے آپ پورے ہندوستان میں مرجع علماء وفضلاء

تھے آپ 19 ویں صدی کے بیشتر خدام حدیث نبوی ﷺ کے شیخ واستاد تھے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق علم حدیث کے تمام گوشوں میں بہت بلند مقام رکھتے تھے بہت زیادہ متقی، پرہیز گار، تقوی وطہارت کے پیکر، عابد، زاہد، متواضع، کریم النفس، متبع سنت اور صابر وشاکر تھے۔

مولانا سید رئیس احمد جعفر ندوی (متوفی 1968ء) لکھتے ہیں کہ

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی انتہائی متقی اور پرہیز گار بھی تھے اور عبادت وریاضت میں مشغول رہتے تھے اس میں ان کی محویت واستغراق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز جب مدرسے میں تشریف لے جا کر دریافت کرتے کہ اس وقت مدرسے میں کون ہے؟ اگر خدام کہتے کہ حضور فلاں ہے تو فرماتے خیر، اگر اور (لوگ) کہہ دیتے کہ میاں اسحاق ہیں تو فرماتے کہ مدرسے کی حفاظت کا انتظام کردو، اسحاق کے بھروسے پر نہ رہو اسباب تو اسباب اگر کوئی مدرسے کی دیواریں اُٹھا کر لے جائے گا تب بھی اُسے خبر نہ ہوگی۔ (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص:281)

علم حدیث میں ان کی تبحر علمی کا یہ مقام تھا کہ ان کے غسل جنازہ پر شیخ عبداللہ سراج مکی نے فرمایا تھا

واللہ انہ لو عاش و قرأت علیہ الحدیث طول عمری ما نلت ما نالہ

اللہ تعالیٰ کی قسم اگر یہ زندہ رہتے اور میں تمام عمر ان سے حدیث پڑھتا رہتا تو اس رتبے کو نہ پہنچ سکتا جس پر یہ پہنچ چکے تھے۔ (الحیاۃ بعد المماۃ، ص:38)

مولانا شاہ محمد اسحاق نے 40 برس تک حدیث کی تدریس فرمائی جس کے باعث آپ نے ''صدر الحمید'' کے لقب سے مشہور ہوئے جیسا کہ المسوی شرح موطا امام مالک میں منقول ہے۔

اخبرنا بکتاب المسوّی من أحادیث الموطا الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق بن محمد افضل العمری الدهلوی عن جده لانه من قیّم الطریقة (لولی اللهیّه) الامام عبد العزیز بن ولی الله الدهلوی عن أبیه [1]

تصنیف میں مسائل اربعین، مائۃ مسائل، تذکرۃ الصیام ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی رحمان علی بریلوی نے ''فتاوی ہندی'' اور مولوی محمد محسن ترہتی نے ترجمہ مشکوۃ المصابیح کا ذکر کیا ہے۔ [2]

---

[1] المسوی من احادیث الموطا 3/11 مطبوعہ المکۃ المکرمۃ [2] تراجم علمائے حدیث ہند، ص:119۔ تذکرہ علمائے ہند، ص:178۔ الیانع الجنی، ص:77

وفات

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی نے رجب 1262ھ مطابق 1846ء میں مکہ مکرمہ میں انتقال کیا اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (1)

مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی (متوفی 1341ھ) فرماتے ہیں:

علامة الزمان، وترجمان الحديث والقرآن، محيي العلوم العربية، وبدر الأقطار الهندية، السيد الشريف صديق حسن بن أولاد حسن بن أولاد علي الحسيني البخاري القنوجي، صاحب المصنفات الشهيرة والمؤلفات الكثيرة. (2)

محترم علامہ الزمان ترجمان حدیث وقرآن، علوم عربیہ کو زندہ کرنے والے، سارے ہند کے چاند، سید شریف صدیق حسن بن اولاد حسن بن اولاد علی حسینی بخاری قنوجی، مشہور صفات کے مالک اور بہت زیادہ تالیفات والے تھے۔

9 جمادی الاولی 1248ھ اپنے ننھیال بانس بریلی میں پیدا ہوئے تعلیم کا آغاز اپنے برادر اکبر مولانا سید احمد حسن عرشی (متوفی 1277ھ/ 1860ء) سے کیا اس کے بعد فرخ آباد اور کان پور تشریف لے گئے اور دونوں شہروں کے اساتذہ سے مختلف علوم میں استفادہ کیا۔ 1269ھ میں دہلی تشریف لائے اور صدر الافاضل مفتی صدر الدین آزردہ (متوفی 1285ھ/ 1868ء) کی خدمت میں ایک سال 8 ماہ رہ کر علوم عقلیہ ونقلیہ میں اکتساب فیض کیا علاوہ ازیں ان کے شیخ زین العابدین انصاری، شیخ عبدالحق بنارسی تلمیذ امام شوکانی، شیخ یحییٰ بن محمد اکاذمی، علامہ سید نعمان خیر الدین آلوسی (مفتی بغداد) علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری اور مولانا شاہ محمد یعقوب بن مولانا شیخ محمد افضل فاروقی سے بذریعہ خط سے حدیث میں سند واجازت حاصل کی۔ (3)

21 سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرکے دہلی سے اپنے وطن قنوج تشریف لے گئے اور قنوج میں کچھ عرصہ قیام کے بعد بسلسلہ تلاش معاش ریاست بھوپال چلے گئے بھوپال کے آپ نے تین سفر کیے اور آخر ان کا نکاح نواب شاہجہان بیگم صاحبہ سے ہوا جو بیوہ ہو چکی تھیں انہوں نے نواب صاحب کی دیانت

---

(1) تراجم علمائے حدیث ہند، ص: 115، (2) نزہۃ الخواطر 8/ 187، (3) تراجم علمائے حدیث ہند، ص: 281

وقابلیت دیکھ کر شریک امور سلطنت بنایا جس کی وجہ سے آپ دین ودنیا کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔

نواب صاحب کی دینی خدمات

شریک امور سلطنت ہونے کے بعد حضرت نواب صاحب نے دین اسلام کی خدمت میں وہ حصہ لیا جس کی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے دوسرے الفاظ میں نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ قلب انسانی پر اس کا واہمہ گزرا۔

كذافي الحديث: ما لا عين رأت و لا أذن سمعت و لا خطر على قلب بشر

خدمت قرآن وحدیث میں حضرت نواب صاحب نے زرِ کثیر صرف کر کے تفسیر وحدیث کی ضخیم کتابیں چھپوا کر علمائے کرام میں مفت تقسیم کیں۔ نیل الاوطار، تفسیر ابن کثیر اور فتح الباری شرح صحیح البخاری، یہ تینوں کتابیں

نیل الاوطار: 25 ہزار روپے

تفسیر ابن کثیر: 20 ہزار روپے

فتح الباری کا نسخہ 6 سو روپے میں مصر سے خریدا

اور ہزاروں کی تعداد میں یہ تینوں کتابیں چھپوا کر علماء میں مفت تقسیم کیں۔ ہندوستان میں فتح الباری سب سے پہلے جماعت اہلحدیث کے جلیل القدر عالم دین، محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی رئیس بھوپال کی خروانہ ضیافتوں کے طفیل پہنچی۔

تصانیف

حضرت نواب صاحب کا شمار صاحب تصانیف کثیرہ میں ہوتا ہے آپ نے مختلف موضوعات پر عربی، فارسی اور اردو میں 222 کتابیں تالیف فرمائیں۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	موضوعات	عربی	فارسی	اردو	میزان
1	تفسیر	2	3	1	6
2	حدیث	19	4	10	33
3	عقائد	9	4	17	30
4	فقہ	4	7	12	23
5	تردید تقلید	5	4	2	11

6	سیاست	2	1	3	6
7	تاریخ وسیر	6	10	6	22
8	مناقب	4	3	6	13
9	علوم وادب	13	4	5	22
10	اخلاق	3	4	31	38
11	تردید شیعت	۔	۔	1	1
12	تصوف	۔	7	10	17
	میزان	67	51	104	222

تراجم علمائے حدیث ہند، ص:298 تا 311

حدیث کی چند مشہور تصانیف

حضرت نواب صاحب نے حدیث اور متعلقات حدیث پر (33) چھوٹی بڑی کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں تالیف فرمائیں۔ ذیل میں چند مشہور تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ عون الباری لحل ادلة البخاری (عربی)
2۔ السراج الوهاج من كشف مطالب صحيح مسلم بن الحجاج (عربی)
3۔ توفيق الباری لترجمة الادب المفرد للبخاری (اردو)
4۔ مسک الختام شرح بلوغ المرام (فارسی)
5۔ فتح العلام شرح بلوغ المرام (عربی)
6۔ موائد العوائد من عيون الاخبار والفوائد (فارسی)
7۔الحطه فی ذكر الصحاح الستة (عربی)
8۔ عين القين ترجمه اربعين(اردو)
9۔ غنية القاری ترجمه ثلاثيات البخاری (اردو)
10۔ تميمة الصبی فی ترجمه الاربعين من احاديث النبی صلی الله عليه وسلم (اردو)
11۔ الروض البسام من ترجمه بلوغ المرام (عربی)
12۔ خير القرين فی ترجمه الاربعين (اردو)
13۔اربعون حديثاً فی فضائل الحج والعمرة (عربی)

14۔ اربعون حدیثاً متواترۃ (عربی)
15۔ رغل الامانی بشرح مختصر الشوکانی (عربی)
16۔خیر الاصول فی احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (اردو)
17۔ منہج الوصول الی اصطلاح احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (فارسی)

(جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات،ص:39 تا41، 88)

وفات

حضرت نواب صاحب نے 29 جمادی الثانی 1307ھ مطابق 17 فروری 1890ء کو 59 سال کی عمر میں بھوپال میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(تراجم علمائے حدیث ہند،ص:277)